

چند قدم اقبال کے ساتھ

محمد ظہیر الدین احمد

ناشر

اقبال اکیڈمی حیدرآباد (انڈیا)

۴۳۵

مدرسہ النورینسنگ کوئٹہ۔ افرام کلا

اب لایعین

مدرسہ النورینسنگ

۱۹. ۶. ۲۰۱۲

چند قدم اقبال کے ساتھ



محمد ظہیر الدین احمد

ناشر: اقبال اکیڈمی حیدرآباد۔ (انڈیا)

فون: 040-66663950

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : چند قدم اقبال کے ساتھ

مصنف : محمد ظہیر الدین احمد

سزا شاعت : 2012ء

تعداد اشاعت : 500

کمپوزنگ و : شارپ کمپیوٹرس، ملک پیٹ حیدر آباد،

طباعت : فون: 9392427796

قیمت : 150 روپے

ناشر : اقبال اکیڈمی، حیدر آباد۔ (انڈیا)

ISBN : 81-86370-50-1

کتاب ملنے کے پتے

☆ اقبال اکیڈمی، گلشن خلیل، 10-5-7/1، تالاب ماں صاحبہ، حیدر آباد

500028، آندھرا پردیش (انڈیا)۔ فون 66663950

e-mail: ihfiqbal@hotmail.com

☆ اردو بک ڈپو، انجمن ترقی اردو، گلشن حبیب، اردو ہال

نمائت نگر، حیدر آباد۔ فون: 040-23222919

☆ سب رس کتاب گھر، ادارہ ادبیات اردو، پنجہ گٹھ، حیدر آباد

☆☆☆

فہرست

۷	۱	حب رسولؐ کے قاضی
۱۵	۲	عبدۃ ورسولہ ﷺ
۲۱	۳	سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے
۳۰	۴	ہجرت آئین حیات مسلم است
۳۷	۵	عقیدہ ختم نبوت کی تہذیبی قدر
۴۶	۶	امت میں اختلافِ رائے کے آداب و حدود اسوۂ حسنہ کی روشنی میں
۵۲	۷	اقبال کا مطالعہ کیوں؟
۵۹	۸	فکر اقبال کے چند امتیازی پہلو
۶۵	۹	عصری ہندوستان میں اقبال کی معنویت
۷۲	۱۰	مسلم طلباء و طالبات کی شخصیت سازی (تعلیمات اقبال کی روشنی میں)
۷۹	۱۱	عبدالرحمن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمینِ اندلس میں (بال جبریل کی ایک نظم کا تجزیاتی مطالعہ)
۹۶	۱۲	”ذوق و شوق“ ایک مطالعہ
۱۱۱	۱۳	اذان، صلوٰۃ، قیام اور سجدہ (اقبال کی شاعری میں)
۱۲۶	۱۴	دواہر دکھ کی ہے، مجروح تیغِ آرزو رہتا
۱۳۰	۱۵	وقتِ آخر اور کشمکشِ کار

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اقبالیات پر یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا اگر بہ حیثیت مضمون نگار کچھ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کر دی جائیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا کہ میرے مضامین پر مشتمل یہ کتاب شائع ہو کیوں کہ اقبالیات اور اس کے مختلف شعبوں پر ہزاروں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہورہی ہیں۔ لیکن اقبالیات اور اقبال اکیڈمی سے برسوں کی وابستگی کی وجہ سے بعض مخلص احباب اور بزرگوں کی توجہ دہانی پر اس کتاب کو شائع کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

ان بزرگوں میں خصوصاً پروفیسر سید سراج الدین مرحوم صدر اقبال اکیڈمی کی توجہ دہانی شامل ہے۔ اسی وجہ سے تقریباً نصف صدی کے دوران لکھے گئے مضامین کو ڈھونڈنا پڑا۔ جو مضامین مل سکے انہیں پیش کرنے کی جرات کر رہا ہوں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں تمام مضامین تقریباً نصف صدی کے عرصہ پر محیط ہیں۔

اس طویل زمانی فصل کی وجہ سے آپ کو بعض مضامین سلیپی معلوم ہونگے،

ان میں تکرار بھی ملے گی اور شاید کبھی کوئی بات کام کی بھی نکل آئے۔

مجھے اقبال اکیڈمی کے بانی اور صدر جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب کے ساتھ کام کرنے

کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد پروفیسر عالم خوند میری، پروفیسر سید سراج الدین صدور اکیڈمی کے علاوہ پروفیسر صلاح الدین اور پروفیسر غلام دستگیر رشید وغیرہ سے استفادہ کا موقع ملا۔ کتنے ہی اہل نظر اقبال شناس ہیں جن کے نام اب مجھے یاد نہیں آرہے ہیں۔ اگر مجھے اقبال پر کچھ کہنے کا یارا ہے تو انہیں اہل فکر و نظر کی دین ہے۔

میری حیثیت تو گلدستہ کے اس بندھن کی طرح ہے جو پھولوں کو یکجا باندھے رکھتی ہے۔

ہاں! ایک بات ضرور عرض کرنی ہے مجھے اقبال اکیڈمی کی صدارت مجبوراً قبول کرنی پڑی۔ معاملہ یہ تھا کہ ”کبریا موت الکبائر“ (یعنی بڑوں کی موت نے مجھے بڑا بنادیا) ایک اعزاز مجھے حاصل رہا، جس پر مجھے فخر ہے۔ وہ اقبالیات پر ایک معتبر کتب خانہ کی تنظیم ہے اس کتب خانہ سے وابستگی کچھ جذباتی سی ہے۔ آنے والوں سے میری گزارش ہے کہ وہ اس ذخیرہ کی نہ صرف حفاظت کریں بلکہ کتابوں میں اضافہ اور کتب خانہ کی تنظیم اور توسیع پر توجہ فرمائیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات عرض کرنی ہے کہ مجھے گوارا نہیں تھا کہ اس کتاب کی اشاعت کا خرچہ اقبال اکیڈمی برداشت کرے۔ میری اس خواہش کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد مجیب الدین ایم۔ ڈی (امریکہ) جو چھ ماہ قبل امریکہ سے آئے ہوئے تھے ملاقات کے دوران انہوں نے ان مضامین کی اشاعت پر توجہ دلائی۔ ان کے ذہن میں اقبال اکیڈمی کے قیام سے قبل شعور میں شائع ہونے والے مضامین بھی تھے۔

پتہ نہیں یہ بات ازراہ محبت تھی یا ان کی نظر میں ان مضامین کی کچھ وقعت بھی تھی۔ میرے ابتدائی دور کے مضامین جو ان کی نظر سے گزرے تھے۔ کچھ فراہم ہو سکے اور کچھ دستیاب نہ ہو سکے۔ بہر حال انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کی مالی ذمہ داری قبول کی اللہ پاک انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

شاید اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا کہ اقبال پر لکھتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہی کہ اقبال کو اپنے دور کے حالات اور تقاضوں کی روشنی میں سمجھا جائے کہ اقبال ہمارے لئے کس حد تک بامعنی ہیں۔

اس لئے میرے مخاطب زیادہ تر طلباء و جوان رہے۔

ایک بات اور! کہوں یا نہ کہوں 1986ء میں اقبال صدی تقاریب کے دوران بعض احباب کے ہاتھوں کچھ ناگوار باتوں کو بھی برداشت کرنا پڑا۔ شاید ان باتوں کا دل پر اثر تھا کہ اس دوران اقبال میرے خواب میں دوسرے تشریف لائے۔

اقبال اکیڈمی سے وابستگی کے دوران شروع سے یہ کاوش رہی کہ شہر کے اہل نظر کو اقبال

اکیڑی اور کلام اقبال سے جوڑے رکھوں تاکہ ان حضرات کی ژرف نگاہی سے اقبال فہمی اور اقبال شناسی کی نئی نئی راہیں کھلیں اور کلام اقبال کا فیض نو جوان نسل تک پہنچے۔
چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی لیکن یہ شعر پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

گرچہ از نیکاں نیم ، خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاض آفرینش رشتہ مگدستہ ام



”جب ہم اقبال کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسلوب بیان کی دلکشی، صوتی آہنگ کا اعجاز، الفاظ کا قرینہ و انداز، ایک محویت کی سی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ شدت تاثر کی اس منزل سے آگے نئی تراکیب و تشبیہات، نئے استعارات اور علامت کی ایمائیت، رمزیت، اور اشارت، معانی و مفاسیم کی بے پناہ وسعتوں اور گہرائیوں میں پہنچا دیتی ہے اور پھر تاریخی اور عصری شعور کی شائستہ عکاسی اقبال کی خلاق اور توانا فکر کو اپنے عہد کے لئے بامعنی بنا دیتی ہے اس سے آگے ایک اور منزل بھی ہے جسکی جانب اقبال نے متعدد مقامات پر اشارہ کیا ہے، جہاں وجدانی سرچشموں سے سیراب ہو کر، باطن کی سرشاری و شادابی، شاعری کو حدیث غلو تیاں بنا دیتی ہے۔ اب یہاں وہ قاری سے جذب دروں اور نگاہ شوق کے ساتھ ”یک لمحہ بدل در شو“ کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس منزل پر یہ بات آشکار ہو جاتی ہے۔

”فغان نیم شمی بے نوائے راز نہیں“

محمد ظہیر الدین احمد

گلشن غلیل، تالاب ماں صاحب، حیدرآباد

۲۱، اپریل، ۲۰۱۲ء

حب رسول ﷺ کے تقاضے

زندگی میں سوز و گداز، حرکت و حرارت، آرزو کی خلش اور خوب تر کی پیہم تلاش محبت ہی کے دم سے ہے۔ بلکہ ایمان، وارفتگی اور شیشنگی سے ہی عبارت ہے، ایمان کے دائرہ میں آ جانا، محبت کے دائرہ میں آ جانا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے ”جو ایمان لائے وہ اللہ سے نہایت درجہ محبت رکھتے ہیں۔ (والدین آمنوا اشدُّ حباً للہ) خدائے واحد پر ایمان کے ساتھ ہی رحمۃ للعالمین و خاتم النبیین پر ایمان اور محبت لازمی ہے۔ کلمہ شہادت کا دوسرا جز آنحضرت ﷺ کی عبدیت اور رسالت کا اقرار ہے۔ اس طرح ایمان کی بنیاد ہی اس ذاتِ گرامی سے عقیدت اور محبت ہے جو نہ صرف مثنائے تخلیق ہے بلکہ منتہائے تخلیق بھی ہے یعنی تمام صفات و کمالات کا مظہر اتم ہے۔

اسلام کی ساری تاریخ آپ کے نام لیواؤں کی عقیدت و محبت سے پُر ہے۔ اسی محبت کی لطیف کیفیات و جذبات نے نعت کی روایت ڈالی۔ درود و سلام کے مختلف دلشیں، پر سوز و پُر اثر اظہارات ایک مومن کی اسی وابستگی اور شیشنگی کا اظہار ہیں۔ یہاں جس پہلو پر غور کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس محبت و عقیدت کا تقاضا کیا ہے۔ حقیقی محبت خود ایک حال ہوتی ہے جو ”قال“ کی محتاج نہیں۔ محبت کسی اظہار کی تابع نہیں ہوتی۔ ہر دیکھنے والا اسے محسوس کر لیتا ہے۔

لیکن آج اس نازک و حساس موضوع کو ”قال“ بنادیا گیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے مضمرات پر غور کئے بغیر ہم سہولت کے ساتھ ”حب“ رسول ﷺ کی بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ بلکہ اتباع سنت و اطاعت کے نام پر ہی ایسی باتیں ہوتی بھی ہیں جو حضور ﷺ کے نام لیواؤں میں محبت کو نہیں نفرت کو جنم دیتی ہیں۔ نیتوں کی بات، دل کا بھید تو اللہ ہی جانے لیکن اس سے زیادہ محرومی و بد نصیبی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ درود و سلام کی بات ہر سر عام نزاغ کی وجہ بن جائے، جزوی و فروعی مسائل میں بحث و جدال اتنا بڑھ جائے کہ اسوۂ حسنہ ہی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

پیغمبروں کی پاکیزہ زندگیوں کے بارے میں افراط و تفریط کے نتائج دیکھنا ہو تو صرف یہود و نصاریٰ کی تاریخ کافی ہے۔ ایک گروہ نے ظاہر اور کتاب کے پہلو پر اتنی شدت اختیار کی کہ پیغمبر کی ذات اوجھل ہو گئی۔ اور دوسرے گروہ نے پیغمبر کی ذات کے بارے میں اتنا غلو کیا کہ اصل پیام ہی گم ہو گیا۔ اسی افراط و تفریط کی کچھ کیفیات ہماری امت کے اندر بھی کہیں درود و سلام کے نام پر ہوتی ہیں اور کبھی سنت اور اتباع کے نام پر۔ نہ اتباع بلا محبت پسندیدہ ہے نہ محبت بلا اتباع مستحسن ہے۔ بات دراصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہم نے نہ تو رسول اللہ ﷺ کے مقام و منصب کو سمجھا، نہ آپ کی دعوت کے منشاء و مقصد کو جانا اور نہ آپ کی امت کے ایک فرد کی حیثیت سے اپنے آپ کو پہچانا، اس منصب اور اس کی ذمہ داری کا جب احساس ہوتا ہے تو بڑے سے بڑے اہل دل بھی کانپ اٹھتے ہیں کہ کیا انہیں واقعی اپنی محبت کے اظہار کا حق ہے۔

ایک بزرگ سے ان کے ایک ارادت مند نے عرض کیا کہ سرکار! مجھے ایسا وظیفہ بتا دیجئے کہ خواب میں حضور اکرمؐ کے دیدار سے مشرف ہو سکوں ان بزرگ نے جواب دیا آپ کا بڑا حوصلہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم تو اپنے آپ کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ کبیر خضرؑ کا ہی دیدار ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال جیسے عاشق رسولؐ نے کہا ہے کہ: جب میں درود پڑھتا ہوں تو میرا وجود شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے اور عشق یہ طعنہ دیتا ہے کہ تو، تو محکوم غیر ہے، ذرا اپنے دل پر نظر کر کہ کتنے بت براجمان ہیں، جب تک اس ذات گرامی کے رنگ کا پر تو تیرے اندر پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک اس نام مبارک کو اپنی زبان پر لانے کی جرأت نہ کر

چو بہ نام مصطفیٰؐ خواہم درود
از فحالت آب می گردو وجود
عشق می گوید کہ اے محکوم غیر
سینہ تو از بتاں مانہ ویر
تانداری از محمدؐ رنگ و بو
از درود خود میالا نام او

محبت کے تقاضے کو سمجھنا ہو تو اس ذات گرامی سے ہماری نسبت اور ربط کی معنویت کو سمجھنا

ہوگا۔ آپ ایک ایسے وسیع، عالمگیر اور ہمہ جہتی انقلاب کے بانی ہیں جو صرف ماضی سے متعلق نہیں بلکہ جس کا سلسلہ جاری ہے۔ ہم سب کا ايقان ہے کہ آپ کا اسوۂ حسنہ ابدی ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ یہ اسی ہدایت کا فیضان ہے کہ بہ حیثیت امت ہمارا مقام، ”شہداء علی الناس“ کا ہے جب کہ آپ ﷺ کی ذات گرامی، ”یکون الرسول علیکم شہیدا“ کے اعلیٰ و ابدی مقام پر ہے۔ گویا آپ کی ذات سے نسبت و ربط اور شیفتگی اور محبت کا بنیادی تقاضا ہے کہ ہم میں اپنے منصب سے آگاہی اور باخبری کا احساس تازہ ہے۔ ”اور شہداء علی الناس“ کے زمرہ میں شامل ہو کر ساری انسانیت کی تشکیل پر اثر انداز ہوں۔ اسی پس منظر میں اتباع اور اطاعت کا مفہوم بھی واضح ہوتا ہے، یہ رسول اللہ کی اتباع ہی ہے جو اللہ سے محبت کرنے والے کو اللہ کا محبوب بھی بنادیتی ہے۔ ”ان کنتم تحبون اللہ فانبعونی بحبکم اللہ“ ایک مومن کے لئے اس سے بڑھ کر عزت و افتخار کی کون سی بات ہو سکتی ہے کہ محبت، محبوب بھی بن جائے لیکن اس کی شرط اتباع رسول ہی ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس اتباع میں جب محبت شامل نہ ہو تو یہ نہ صرف میکا کی بن جاتی ہے بلکہ روح سے عاری ہو جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ذات رسالت مآب سے محبت ہمیں آپ کے لائے ہوئے پیام کو جاری و ساری کرنے کی امانت سے بھی مربوط کر دیتی ہے۔

جہاں تک انفرادی زندگی میں سنت کی پیروی اور اتباع کا سوال ہے ہر چاہنے والا یہ چاہتا ہے کہ اس کے ظاہر پر بھی محبوب کا رنگ چڑھ جائے، اگر ظاہر میں محبت اور عشق کا جذبہ کارفرما ہے تو یہ نہ صرف قابل احترام ہے بلکہ اس پر کلام بھی سوائے ادبی ہے۔ لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ سنت کی اتباع اور سنت کی پیروی کے وسیع مفہوم اور اس کے مضمرات کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے رسول اکرم کا ارشاد ہے: جس نے سنت کو زندہ کیا اس نے مجھے زندہ کیا۔ اور جس نے مجھے زندہ کیا، اس نے محبت کی مجھ سے، اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا۔ یہاں پھر میں یہ عرض کروں گا کہ ایک ابدی پیام کو نہ صرف پیش کرنے والی بلکہ اسے عملی زندگی میں برپا کرنے والی برگزیدہ ہستی کی سنت کو زندہ رکھنے کا کیا مفہوم ہے؟ جب تک کہ سنت نہ صرف ہماری روحانی زندگی بلکہ تاریخی عمل سے مربوط نہ ہو جائے۔

شاید یہ بات قرآن مجید کی اس آیت سے واضح ہو جائے جہاں اللہ کی محبت اور رسول کی محبت کو جہاد فی سبیل اللہ سے مربوط کر دیا گیا ہے۔ ”آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے،

غیرت و حمیت کی، اہری کہتا ہے، یا محبت آپ کے اسے ہوے یہ مروت کی مظلومیت و
دور کر سکتی ہے اور آپ کے نام لیواؤں پر ظلم و ستم کو برداشت کر سکتی ہے؟

محبت اور عشق کے رستے میں غیرت و حمیت کی ایک مثال، اقبال کی زندگی میں پیش
آنے والے واقعات میں بھی ملتی ہے، جس کا غیر اقبال کی نظم ”سور اور کر اپنی“ میں ہوا
نہ، اور کے ایک جوان ماری ہم مدین کی غیرت سرکاروں صوبہ کی شان میں کشتی
کے، اور کے جو کو برداشت نہ کر سکی اور اس غیرت نے قید میں اس نے موت بوٹے سے
ٹائی۔ اسی طرح ایک وفد مہداتیم نامی ایک اور جوان سے چلتی آیا جو کر پتی میں، اور یہ ماری
چاہتا تھا۔ جب اسے موت کی سزا سنائی گئی تو اس نے جج سے ٹی طلب ہو کر رہا۔ جج صاحب اس
کے ہاتھ پر یہ ”کہتا ہوں کہ مجھے موت کی سزا دی۔ یہ ایک جان سن سکتی میں ہے اس میرے پاس
وہ کچھ نہیں جی ہو میں تو ناموس رسوں پر پٹیا اور ایتنا۔ اس سزا کے موت کو قید میں بدلنے کی،
اور اس کے سفارش کرنے کے لئے کر پتی کے سربراہوں کا ایک وفد اقبال کے پاس آیا۔
ماری کارروائی کرنے کے بعد قبال نے پوچھا۔ کیا مہداتیم کمزور پڑیا ہے؟ وفد ارمان کے جا
”نہیں، وہ تو اپنے قدم کا اقبال کہتا ہے، اور مجھے بخوریر کہتا ہے کہ میں نے شہادت خریدی
نہ۔ یہاں اقبال کا جواب بڑا پر اثر ہے۔“ جب وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے تو
میں اس کے اجر و ثواب کی راہ میں کیسے حاصل ہو سکتا ہوں۔ یا تم یہ جانتے ہو کہ میں اپنے مسلمان
نے دے دے کی خوشامد کروں جو زندہ رہا تو ماری ہے اور مر گیا تو شہید“ اس میں ”لا میں
اقبال کی نظم ”لاہور اور کراچی“ کو دو بار دہرائے۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالم معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدرو قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مرد مسلمان تجھے کیا یاد نہیں
”لَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ“

بہت کامیابی رہے والوں ، یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ سلفوں سے ہم
 گندہ و گدہ ، دیو باکے دیو ، بگنی بگنی بہت مانتے "بے خاک و خون غنیمتیں" کی مراد سے
 لینا پڑتا ہے۔ نئے تمدن اس میں بھی نہیں ، انہی سے یہ انفرادی زندگی میں ، مادی
 ارتقاء کی زندگی میں سے ہمارے لئے جس حد تک متعلق و متعلقہ ہے ، میں نے نہیں دیکھا
 و نہ پہنچا ہوتا ہے۔ یہ تصور اس نسبت و وابستگی کے اور سے پہلے ہی تھا ، کہ ہے
 نہ اس کے لئے کسی مرتبہ کی جان بوجھ و صرف و صرف اس لئے رشتہ و استوار آتی ہے۔ یہ سچا
 یہ بھی ہے کہ آپ اردو ادبی زندگی میں اس کی معنویت و مہم چاہے بہت چاہتے رہے ہوں
 کہ سب کی مناسبت و اختلاف کی یہ زندگی ہم سے ہم سے متعدد و متنوع دنیا میں آئے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات یہ ہے کہ ان تمام سلسلوں کی ذات برائی سے ، سچی ہی
 مادی مت کے لئے ان بنیاد ہے آپ کے بہت ہی میں اس رشتہ کی ستارہ کی مشرق ہے۔ اقبال
 نے کیا خوب بات کہی ہے۔

فرد از حق و ملت از وئے زندہ است

اس کا مطلب یہ ہے کہ ملت کی حیات الگ الگ ہے ، دار و مدار اس کا اس کے سچے ہی سے
 ہے۔ لیکن سچی یہ نہیں ہو رہا ہے کہ ملت کے مختلف رویوں میں جزوی اور فردی مسائل پر
 اختلاف ، سچی ملت کی جان اور بہت سے کام پر پیدا کیا جاتا ہے۔ اردو و اسلام کے نام پر بھی آئیں
 میں نہرت کی اور سچی کی جاتی ہیں ، ایک اور سے پر ہر عام طرز و طریقہ و رویہ پاتا ہے۔
 اس قسم کے اختلاف سے بہت سے کام پر ، اس طرح ملت کے نام پر آپس میں کی گئی و پیدا
 نے کی و تکی سلف و نئے سلفوں کی مدد دیتی ہے۔ روضہ شمس رسول حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ
 سے یا انہی بات ہی ہے۔ "میں یہ نہیں چاہتا کہ حق یہ ہیں (فردی مسائل پر) اختلاف نہ
 رہتا ہوگا۔ یہ میں کہ فردی مسائل میں حق یہ کا یہی قول ہوگا تو انہوں کو اس سے بڑی تکلیف
 نہوتی ہے۔ سب سے زیادہ اپنی سچی کی سچی کی سبب خیر و برکت سے و باعث فساد و برباد
 ہے۔ اس بارے میں کوئی شخص سچی کی سچی کے قول پر ٹٹل کر سکا تو اسے سنت تصور کیا جائے گا۔"

رسول اکرم ﷺ سے بے عشق اور محبت کے علی ثبوت سے یہ کرام کی زندگیوں کے ملوہ اور کہاں مل سکتے ہیں لیکن اس محبت کا ثبوت، جی شری کے جس انداز سے یہ یہ وہ قول غور ہے، یہ ہال تھے جن کی اذان عشق کا ترانہ بنی، یہ صدیق تھے کہ جب عقبہ بن ربیعہ نے ان کے چہرے پر پھٹے، ان کے جوتوں سے پیہم نہ ہیں لگا میں اور سینے پر سوار ہو کر اس قدر زور و جوش با کہ ان کی حالت تھی گات، ان کی کہ خاتمہ کے جوت انہیں اس حال میں ایک کپڑے میں اٹھا لے کہ ان کی موت میں وہی شہادت تھی لیکن ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے انہوں نے رسول اکرم کی خیریت دریافت کی، انہیں سمینان کے پر بھی نہیں دیا اور کہا کہ خدا کی قسم میں اس وقت تک جانے اور پانی و ہاتھ نہ دلاؤں گا جب تک رسول خدا کے یہاں سے اپنی آنکھیں روشن نہ کر لوں، لیکن صدیق کی یہی محبت اس انداز کے بھی جہود و زہول کے وقت آئے پر اپنی ساری دوست، اپنے سارے اہل بیت و جوت کے قدموں پر چنچا اور دیا اور خود زبان رسالت کے اہل و عیال کے ساتھ چھوڑنے کے بارے میں ارشاد ہوا تو جواب ملتا ہے۔

پروانے کو چراغ، ہے بلبل کو پھول بس

صدیق کے لئے ہے، خدا کا رسول بس

محبت کے نتیجے میں یہ عمر کی میت تھی کہ رسول ﷺ کے فیض سے راضی نہ ہو کر ان سے رنج و غم کے لہجے کا فیصلہ ہوا ہے یہ۔ یہی محبت ایمان کے ایثار و قربانی کے بھرتی ہے۔ عشق کا یہی تہ نہ تواریف کی چھان میں ہی ہمارے مبارک پر لیٹ کر جو ہوں کو امانتیں دیتے ہیں، یہی کی ذمہ داری قبول کرنا ہے۔

پورے غزوات کے واقعات کو پڑھ جائے اندازہ ہوگا کہ محبت اور عشق کی بات کیسے کی جاتی ہے۔ تنہا کے مواقع نہیں صرف احمد کے عزہ و کوہکے کے عشق رسول میں جس سے اس کے ہاتھ کی کامیابی ہو گیا جب دشمنوں کے دل نے دل حضور اکرم پر پانی پھینک کر کے ڈال دیا، بنی سہیل انساویوں کے ساتھ حفاظت کے لئے آئے بڑھے۔ انساویوں نے یہیں جہاں قربان کر دیں۔ آخری وقت زیادہ بن سکے کو حضور اکرم کے پاس، اس حالت میں آیا کہ وہ زخموں سے چور تھے انہوں نے آخری کوشش کر کے اپنے سر کو پائے مبارک پر رکھ دیا۔ اسی میدان ہار رار میں

عبدہ و رسولہ ﷺ

اشپد ان محمد، عبدہ و رسولہ (میں کو اپنی باتوں کے محمد ﷺ اللہ کے عبد اور رسال میں شہادت کے بارے میں سنہرا رزمی بات بری کے بارے میں چہدہ و رسولہ کے ان ۱۱ بیہوش کی شہادت بڑی پیغ اور معنی خیز ہے۔ یہ سوں بڑا اہم ہے کہ اس شہادت کی معنویت یہ ہے اس لئے کہ یہ وہی نہ صرف آپ کی شخصیت کے مرتبہ و مقام کو ثابت کرتی ہے بلکہ اس کیسے وہ وہی سادہ سادہ کے بارے میں وہاں کے اپنی یہ وہی تفہیم کرتی ہے، درخواہین کی جیسے اور تنہیم میں یہ وہی بڑی معنویت کی حامل ہے۔ دوسری طرف یہ شہادت ہمیں اس ذمہ داری سے بھی آگاہ کرتی ہے جو بہ حیثیت شہداء ہم قبول کرتے ہیں۔ اس لئے اس بات کا سمجھنا ہمارے ذمہ داری ہے۔ سنہرا کہ محمد ﷺ کے مت مہدیت اور مت مہرست کے ان ۱۱ پہلوؤں کی شہادت کا مجموعہ اور اس کے تقاضے اور مطالبات کیا ہیں؟

تاریخ و سب کا مطالعہ ہمیں اس فیہ متوازن صورت میں سے رہنمائی کرتا ہے جو انہی کے رائے کی تہمتوں کے بارے میں فراہم کرتا ہے۔ نتیجہ ہوتا ہے شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی نہ کسی انداز میں خود ہمارے اندر ایسے رجحانات درآتے ہیں جو ہمیں راہِ حقدار سے ہٹا دیتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اس مطالعہ ترین شخصیت کے ان روحانی اور تاریخی بعد و راز کے درمیان رہاؤں اور کی طرف توجہ سے قیام رہ جاتے ہیں ایک طرف تو دائرے و ہریت سے اس مطالعہ سے جاتے ہیں کہ اس کا تاریخی اور انسانی مشہور منظر انداز ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ تہمت کیسے کہ تاریخی پہلو پر ہماری توجہ اس حد تک مرکوز ہو جاتی ہے کہ روحانی پہلوؤں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ بات شاید یوں واضح ہو کہ سنہرا اگر مہر کی شخصیت کا ایک بعد مہدیت کا ہے جو حقیقت کے ازلی اور ابدی سرچشمہ سے مرہون رہتا ہے تو شخصیت کا دوسرا بعد تاریخی بعد ہے جو عالم انسانیت سے منسلک کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک تعلق مع اللہ ہے اور دوسرا تعلق مع انشوق ہے۔ ان دو پہلوؤں کو ہمیں اس ذات لہائی کے spiritual

اسی سلسلہ میں اقبال نے یوں بھی کہا ہے۔ ”ایہ عشق و مستی میں ہی اس وہی آخری“
 وہی بتا رہی ہے اپنی انتہا بھی ہے بویا تخلیق اور تکوین کی بت، حقیقت گم یہ ہے اور اس کی
 تہ رسالت گم یہ ہے۔ ایک بزرگ نے اس کی مزید تشریح جس کی ہے کہ مختلف انبیاء کا منہ پر راسخ
 مدارج گم یہ گناہور ہے۔ آپ کا وجود مبارک آیہ کائنات کا معنی، پریدہ ہے۔

بہت مقرب عبدہ کی اس روشنی میں سیرت طیبہ کو دیکھئے کہ ہر آن اللہ سے رشتہ استوار ہے،
 حقیقت و صداقت کے سرچشمہ سے ربط کامل ہے۔ یوں وہ یحییٰ کی پختگی، تسلیم و رضا، پیہ و پی، انبیا میں
 کا جامعہ ہے۔ اس تہانِ مہریت کا استعراق و انہماک اور ندی کا سرازیر ہونا، ظہر یہ روش و روشی ہے
 کہ یہاں میں ہے رب کا شکر زربند و نہ ہوں۔ ایک مہریت شریف ہے یہ دند بیغ فقر کے اس مقام پر
 مہریت کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ ”اسعرۃ راس مالی“ (”حرفیت میں راس لہاں یعنی اصل
 ہو چکی ہے“) ”والحب اساسی“ (”محبت میری بنیاد ہے“) ”والشوق مرکبی“ (”شوق میری ساری
 ہے“) ذکر اللہ انیسوی (ذکر الہی میرا نہیں ہے) خواب بہارِ جناب کا یہ شعر اس حقیقت کی
 ترجمانی کرتا ہے۔

اے کہ ترا سرِ نیاؤ حدِ کمال بندگی

اے کہ ترا مقامِ عشقِ قرب تمام عین ذات

اب آئیے دوسرے پہلو کی طرف جو تکمیل رسالت کا ہے۔ کہاں بندگی اور قرب تمام عین ذات
 کے ساتھ ساتھ مخلوق یعنی عام انسانیت سے رشتہ استوار ہے۔ منصب رسالت کے بارے میں قرآن
 میں یوں رشتہ ہوا ”هو الہی ارسل رسولہ بالہدی و دین الحق لبطیرہ علی ابدین کلمہ“
 (اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بے غوث فرمایا۔ اس وقت ہم عین پر غائب ہو گیا
 جاے)۔ اس تاریخی عمل کی بنیاد انسانیت کے سے فخر خوار کی دوسری ہے، رحمت اور رحمت ہے جس
 کی شہادت یوں دی گئی ہے۔ آپ کے قلبِ مطہر پر انسانوں کی تلیف نہایت ترقی پزیر ہے، ہر انسان
 کی فطرت و نہایت کا حد و رجحان ہے (لقد جاءکم رسول من انفسکم عرۃ علیہ صلوٰۃ
 حریص علیکم، بالمومنین رؤف رحیم) اور اس رسالت کا منشا یہی ہے کہ انسانیت کو ہر
 سے نبوت اور طوق و سلاسل سے چھٹکارا دلے اور اسے معبود حقیقی سے روشناس کرایا جاے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے

(یہ مرحلہ ۱۹۰۹ء میں لکھی ایک تقریر تھی)

معراج مصطفویٰ نے صرف تاریخ اسلام پر ہی انسانیت کا ایک شہیم کتاب آفرین واقعہ ہے۔ اور یہی اسرائیل کی ابتدائی آیات اور سارے بنیم سے یہ بات ہوتا ہے کہ تصور کر رہے ہیں بغیر کسی مادی وسائل کے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک شریف سے باتیں۔ روشنی سے ریاض سبک خرام سواری میں افلاک کی سیڑھیاں تھمتے ہیں۔ آیات مادی کا مستند و فراماتے ہیں حقیقی ہستی کی یافت ہوتی ہے۔ قرب الہی کی اعلیٰ ترین منزل تک رسائی ہوتی ہے۔ اس میں کائنات کی قریب مجید و انبیاء ہے کہ مازناں اسرار و لطیفی (نہ کا پچھلی اور نہ فکر بخشی) وقت و ذمہ کی ناقابل تصور و عقیدہ سہٹ گراہیم سے وریک عقیدہ پر مرد و سو جاتی ہیں۔ اس واقعہ کی انداز سے تعبیریں کی گئیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس واقعہ شہیم کے چند اہم پہلوؤں کو روایات میں گم ہیں۔ جہاں تک نبوت کے روحانی مت کے حلق ہے۔ عارفان اسلام نے معراج کے بارے میں اسرار و نکات بیان فرمائے ہیں۔ لیکن مومن اس پر مانتھار موائے کے معراج نبوی کے کیا اثرات انسانی تاریخ پر مرتب ہوئے۔

نبوت کا اہم منصب تاریخ انسانی کی صورت دہی ہے۔ ایک ایسی انسانی تخلیقاتی انداز کی تخلیق سے جہاں فرد اپنے کمالات کو پہنچتا ہے۔ معراج جہاں نام ہے فنا کی تہذیب و انوار و روشنی کی زنجیروں کے ڈھنڈے کا قرب الہی کی اعلیٰ ترین منزل کا وہی اس کا ایک روشنی پہلو ہے جس کا زندگی اور انسانی تقدیر سے گہرا اور معنوی رابطہ ہے۔

اس پس منظر میں آج میری تحریر کا موضوع یہ ہے کہ معراج مصطفویٰ نے تہذیبی پہلو یہ

ہیں؟ اس واقعہ عظیمہ نے تمدن انسانی پر کیا انٹنٹ نقش چھوڑا ہے؟ اور اسلام کے سیاسی اور

سماجی اظہار میں اس واقعہ کا کیا اثر ہے؟

میر کی حیرت انگیز سی باتوں سے اس بوڑھے یہودی کے دل پر پوٹ نہ پڑے حضور اکرم ﷺ کو ایک یہودی کی خاطر کا اکتا پس ہے تو اپنے جہاں شاروں کی اس بڑی آڑ میں تو آپ کے لطیف رسالت و رسوخ کی یہ بغیرت ہوں گا کوئی تین سو کے عرصہ کے بعد اکتا و درمصراب کا یہ اور رشتہ ہی ہوا تھا کہ اب اس سب کا اکتا ہو جاتا ہے۔ ابو طیب کی اخلاقی تائید و مدد کی باتوں میں بڑی ہمت تھی، ایک نہیں چاروں اور اس طرح قریش نے ابو طیب کی خدمت میں رہنے سے کہ آپ اپنے بھتیجے کی تائید سے حضور و اہل بیت میں دھب قتل کی ہانکی دی تھی تو ابو طیب نے اکتا کے اور چار گئے، اسے میرے بھتیجے مجھ پر تھا، نہ نہ الہائے میں سہار نہ سنوں لیکن رہن رسالت سے یہ پر عزم آکر آئی پہنچا جان اس میرے ایک ہاتھ پر سوار بن اور اس سے ہاتھ پہنچ کر نہ رہا یہاں کہ تو جی میں اس کام سے باز نہ آؤں تا تو یہ کام نہ چھوڑا کرتا یا میں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دوں گا۔

اس پر استقامت ملے۔ بعد ازاں اب کی حمایت و تائید کی ساری ساری شہیں اور تدبیریں ناکام ہو گئیں۔

ابو طیب نے تمام کے چند دن بعد ہی حضرت خدیجہؓ کا منہ رقت کے میں لائی حیدانی کا غم کوئی عرصہ کی غم نہیں تھا، یہ باتیں جنہوں نے پتی رفاقت کا حق لیا جنہوں نے یہ ساری اہل و ثروت کو حضور ﷺ کے قدموں پر پٹھا اور روایا، جنہوں نے آپ کی رسالت کی سب سے پہلے تصدیق کی یہ دوصدمات ایسے تھے کہ جس سے اہل عرب کو مایوس کیا، یہ غم و اندوہ کا سبب بنی کہ پاتا ہے شیعہ اہل عرب اور ماسلمان کے بعد سب سے بڑی آزمائش ابھی رہتی ہے۔ وہ منافق کا منہ ہے، لیکن یہاں بھی یہ جواب دہ رحمت و عفو میں ہے ساتھ یہ سلوک و رسالت کی اس کی تنہیدات کا وقت نہیں ہے۔ ٹنڈوں کے ایک ہجوم کو چپے چھوڑ دیا یا نہ سے پھر پور دل کو بھڑوچ کرنے والے فقرے کے لئے، پتھر برسائے گئے اور جسم اللہ سے اکتا نہیں ہوا۔ یحییٰ بن مبارک پیوست ہوئے غمگیں کی ہوئی، یہ مصیبت اتنی بڑی تھی کہ آپ نے فرمایا منافق میں میرے مضائب میری امت کے لئے پر سہ کا کام کریں گے۔

اس کرب و اضطراب کا اظہار میں دعا سے ہوتا ہے تو آپ نے طائف کی حیدانی میں

اب معراج کے بعد دعوت کی قبولیت اور تسخیر کا دور شروع ہوتا ہے ساری انسانیت تاریخ کے ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ رہی ہے۔ سورج بنی اسرائیل کا آواز معراج کے تذکرہ سے ہوتا ہے یلین یہ پورا سوڈ معراج کے اسرار و حقائق نساخ اور احکامات پر مبنی ہے۔ یہودیوں پر یہ بات واضح کر دی جاتی ہے کہ یہیت المقدس پر اب ان کی تولیت کا استحقاق ختم ہونے کو ہے۔ کفار ان قایش کے سامنے یہ اعلان ہوتا ہے کہ پند و نصیحت کا زمانہ زریا اب فیصلہ حق کا وقت آتا ہے۔ ہجرت کا اشارہ اسی سورہ کی اس دعا سے ملتا ہے کہ۔

وقل رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و اجعل لی
من لدنک سلطانا نصیرا (۸۰ : ۱۷)

یہ ارشاد ربانی نصرت و غلبہ کی بشارت لئے ہوئے ہے کہ اب باطل کا جہل چلا ہے۔

وقل حواء الحق و رفق الباطل ط ان الباطل کماں رھوقا (۸۱ : ۱۷)

سیاحی اب اپنی پوری معنوی اور سماجی وسعتوں کے ساتھ طہر ہونے کو ہے۔

معراج کے بعد بیعت غیبی، اولی اور ثانیہ سے اس دعوت کی وسیع پیمانے پر قبولیت کا آغاز ہو جاتا ہے جس کے بعد ہی ہجرت کا مقام آتا ہے۔ جو ایک نئے انتساب کا آغاز بنتا ہے۔ خارجہ و خلیت خارجہ کے نکل کر دعوت حق کی نئی نئی تشکیل کا روپ اٹھانے کو ہے۔ ہجرت کی اقباس نے ایک نئی توجہ پیش کی ہے کہ یہ دشمنوں سے نرنہ سے فارغ نہیں ہے بلکہ زمین پویشی کے خلاف ایک اظہار ہے۔ تسخیر کل حزم ہے، شہنشاہ کی شک آبی سے نکل تسخیریم کا اعلان ہے اور ثبات مسلم کا ایک اہم مرحلہ ہے۔

معراج کے ایک اور اہم تمدنی پہلو کی طرف اقبال نے اپنے پانچویں خطبہ میں اشارہ کیا ہے۔ اس مقام پر انہوں نے مشہور صوفی بزرگ عبدالحق دہلوی کے اس قول کو، جو آیا ہے کہ ”محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر شریف لے گئے اور واپس تشریف لے آئے خدا کی قسم میں اس مقام تک جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔“

طاقت و توانائی کے حقیقی سرچشمہ سے قربت کے بعد ایک نبی کی اس دنیا کے جہد و نسل میں واپسی اس لئے ہوئی ہے کہ ساری انسانیت کی تاریخ میں ایک انتساب برپا کیا جائے۔ اقباس

یہ شعر و سبب نبوت کے لئے، انہیں یہودیوں کی بدترین دشمنی دیتا ہے

خودی کی خلوتوں میں کبریائی

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی

مورانی مصطفائی کا یہ پہلو جس سے اس قدر نفی ریش کا بدترین افسار ہے کہ اس سے

روحانی ترقی کی ساری خاموشیاں بے گناہ کی زبان سے روحانی مقام پر یہ بھی اقرار ہے

جب یہ خاموشیاں سے نہایت بڑے سے پادشاہت مرتب ہوتے ہیں رات و دن یہی یہ ہوتا ہے

پہلے حریت کے انتقام کے لئے یہی ہے کہ نفی روحانی کا بار دہناتا ہے۔ نعمت کے نعمات

میں جہاں انہی کے بارے میں تڑپ ہے وہاں یہی ہے جہاں وہ معرفت کی نئی منزلوں کے ہم

مارہ تار ہے وہاں اس میں وہ عمل کی یہاں جس پر روح دیتا ہے۔

نعمت و نبوت یہی ہے کہ اس سے وہ مقامات ہیں جن کی تکمیل ایک اور ہے۔

سب سے فائدہ کی یہی ہے یہی ہے کہ انہی کے لئے عمل کا عمل اظہار ہے۔

چست جلوت، درد و سوز آرزو است

انجمن دیدار است، و خلوت جستجو است

گرچہ اندر خلوت و جلوت خدا است

خلوت آغاز است و جلوت انتہا است

نہایت بدست کیائی فائدے ہیں کہ یہی سالک نہایت ہی تمام میں ترقی و تربیت

سے بعد خلوت کی جائے خاموشی کے لئے ہوتا ہے، ترقی کے ساتھ ساتھ اللہ کی جانب سے

مہموریت کا یہ پہلو اس کی زور کی زندگی میں اظہار ہے۔

مہموریت کے ساتھ ساتھ بعد کی مدنی دور کے آغاز سے قبل اسلامی معاشرہ کی تسلیں

بنیادی اصول تارک جاتے ہیں۔ شرک سے بچنے کی تاکید کے بعد تمام احکامات و نذاتی

زندگی، انسانی اخلاق، مہموریت، غریبوں اور مسکینوں کے منادات کا تحفہ، وہاں

مناسب استقامت و غرض افشانی زندگی سے متعلق احکام پر مشتمل ہیں جن پر ایک نئے معاشرہ قائم

اور استوار کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔

معراج مصطفویٰ کا یہ عظیم واقعہ اس بات کا درس دیتا ہے کہ خدا جوئی، خدا شناسی کا سفر، سائنس کا سفر نہیں ہے بلکہ ایک نئی طاقت اور توانائی کا حصول ہے تاکہ اس قوت اور توانائی و صلاحیتوں سے ہوتے ہوئے الہی قدروں کو زمانہ کی زندہ حقیقت پر دیا جائے۔

مشہور عالم مہینہ نشینہ نويس سالہ بدنی زندگی میں ۲۰ غزوات میں حصہ لینا پڑا۔ اس کے علاوہ ۳۵ تا ۶۳ بتالی ہے۔ اگر ہم نماز متعہد ۳۵ مقرر کر لیں تو اس کا مقابلہ یہ ہے کہ مشہور عالم مہینہ نشینہ نويس سال کے دور میں ۶۲ جنگی مہمات سر کر لیں پڑیں جس کا اور یہ بتالی ہے وہ میں ایک جنگی مہم کا ہوتا ہے۔ اسی ایک بات سے ہم خوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کی عملی جدوجہد اور کشمکش کا کیا عالم ہوگا؟

زندگی مراقبہ اور مجاہدہ دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ یہ معراج مصطفویٰ کا ایک اور ہم آہنگ پہلو ہے۔ زندگی محض تنہائی کو وہ مومن کا نام نہیں بلکہ سرور و راجہن بھی ہے بدقسمتی سے ہم میں سے بہت سے لوگوں کے نزدیک کسی شخص کے بلند والا ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ دنیا کے ہنگاموں سے بالا ہو جائے۔ کشمکش اور جدوجہد سے پرہیز کرے۔ اپنے ماحول سے بے نیاز ہو جائے۔ لیکن فخر کا صحیح تصور یہ ہے کہ مہتمم مومنین ہاں بازی یہ اسٹ ہے مومنین کا فخر ان کے جو کام نام نہیں ہوتا بلکہ فخر کی اور خالصتہً اوجہ اندہ ہوتا ہے۔ اس تو زنی مثال حضرت علیؑ کی زندگی ہے۔ قبیل حضرت علیؑ مرتضیٰ کے اسکاے راجی کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ بو تراب ہیں تو دوسری طرف حیدر کرار، بو ترابی نام ہے فخر کا، بے نیازی، اقلیم تن کو فتح کرنے کا اور اس کے ساتھ کٹر رکی ضرب ہائے ”پہ پے“ کا نام ہے، قوت کے اظہار کا نام ہے۔ شوکت اور عظمت کا اعلان ہے۔ پھر حضرت علیؑ کا ایک لقب یہ اللہ ہے۔ یہ الہامی عشق الہی کی اس اعلیٰ کیفیت کا نام ہے جہاں بندہ کی مرضی، مولا کی مرضی سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور وہ اس عالم رنگ و بو کی تخیل کرنے والا بن جاتا ہے آپ باب العلم بھی ہیں جس میں کائنات کے ہر پہلو کا علم شامل ہے جو انسانیت کو اس دنیا میں مرہند اور غالب بناتا ہے۔ ”کبھی تنہائی کو وہ مومن عشق رکھتی سوز و درد و انجمن عشق رکھتی سرمایہ مراب و منبر رکھتی مولا علیؑ تھیں عشق“۔

نی معنی میں ساری امت مسلمہ کا اصل ہونے والا پیشوا تھے اور ایک یہ دعوت تھی
 ہے، جو بہت خوبصورت ہے۔ یہاں یہ ہے کہ وہ مغزِ مہادور یعنی مہادت کا مغز، اس کی رکن
 یعنی اس Essence کہا گیا۔ کہاں سے اس کا نام لیا؟ خود دائرہ کی یہ یا جتنی بھی
 انسانی کی اس نہایت آرزو کی ترجمان ہے۔ کائنات کے اس ہونے کے لئے میں اپنی پادشاہ
 جواب سنے۔ اور خدائے بزرگ، برتر کا ارشاد ہے۔ ”مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دیتا
 ہوں۔“ اور ہے کہ ”مومن ایمان لائے گا اللہ کی دین دے گا۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس
 ایک روح کا انجیل ہے۔ قرآن کا جو ہمیں اللہ کی دین دے گا۔ یہ ہے کہ۔ ”وہی اللہ
 حسنة وفي الاحرار حسنة۔“ یہاں سہولت اور اس سے پھر کی جہد جہد سے نہ، ان
 شہوت، اس میں اس اتنا ہی، اس کی جہد و جہد کے لئے ترقیت کا نام ہے۔ مومن جب اس سے
 پہنچتا ہے اس کی ذہن خدا کے آفاق بن جاتی ہے اور اس کی تہیہ کے شہوتان و جہاد کے
 لگتا ہے۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شہستان وجود
 ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذان سے پیدا
 اس کا یہ تمدنی پہلو نہ انداز ہو جائے تو ہمارے مراقبہ، مراقبہ، مراقبہ
 مہادات اپنے مقصد کی تکمیل سے محروم رہتی ہیں۔

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ مرد
 حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
 بات ایک ہی بات ہے کہ اس کی روپ راقمیں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل
 یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
 وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست
 یہ مذہب ملا و مہادات و نہات
 الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
 ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان اور

معراج مصطفیٰ کے جن پہلوؤں کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے اس سے بخوبی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معراج جو کئی دور کے اختصار و تمدنی دور کے آغاز کے درمیان واقع ہوئی یہ تنظیم معنویت اور تمدنی قدر اپنے اندر رکھتی ہے۔ مکی دور میں شانِ مہودیت کا عمل انتہا پر ہے اور مدنی دور میں شانِ رسالت کا عمل ظہور ہے۔ واضح رہے کہ زندگی کے یہ دو رخ علیحدہ نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، حافی ارتقاء کی معراج ایک ایسے ہمہ جہتی انتخاب کا نتیجہ ہے جس پر ہر طرف ماحول، حسن ہے، دنیا کے رنگ و بو اور اس کی ساری جلوہ گریوں کی معراج تخلیق آدم ہے، آسمیت کی معراج انبیاء کرام کا ظہور ہے، نبیائے کرام کی معراج حضور رسالت مآب کا وجود مقدس ہے اور حضور اکرم کی معراج ساری انسانیت کی معراج ہے۔ دو کسمائے معنویت کا مظہر اتم ہیں تکوین اور تخلیق کا آخری اور عمل نمونہ ہیں اور اس معراج کا اتم پہلو یہ ہے کہ اس کے صدقہ میں ساری انسانیت کے لئے آپ کے نام ایوان کے لئے اس کے فیاض اور برکات کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھولے رہتے۔

دنیا میں جہاں بھی کوئی خوبی ہے، جہاں کہیں حسن، کہاں ہے تو کوئی وہ نور مصطفیٰ میں ہے۔ مستحکم ہے یا کہیں خوب سے خوب تر کی جستجو، تکمیل کی طرف پرواز ہے، کہاں کی آرزو ہے تو سمجھ لو کہ اسے نور مصطفیٰ کی تلاش ہے۔

ہر کجا بنی جہان رنگ و بو
آنکہ از خاکش برود آرزو
یا ز نور مصطفیٰ اُدرا بہاست
یا هنوز اندر تلاش مصطفیٰ است

ماخوذ سے۔ نثر ۱۹۸۰ء

ہجرت آئین حیات مسلم است

(یہ دسویں صدی ہجری کے آثار کے مطابق پرکی کی تھیں)

۱۔ تیری تاریخ انسانی میں یہ ہے اور تاریخ آسمانی ہے۔ اس واقعہ کی حقیقت کا اندازہ
سب کی یہ بات سے یہ جاننا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے جس دیر اور وقت میں نصیحت سے یہ کتاب
تفہیم و توحید کی ہے۔ اس کی تفسیر کا جائزہ اپنی ایک دیر پر ہمیں صدیوں پہلے کی تاریخ و توحید کا
اندازہ ملتا ہے۔ امام کا مایہ کے رب اور خدا اب سے ہے۔ اس وقت کی بات ہوئی
ہے اور اس وقت کی و تمہیں کہ توحید کی حقیقت سے لڑنے کا موقع ملے گا۔

[illegible]

جب اپنے نقطہ عروج کو پہنچ جاتے ہیں تو روحانی رتھ کا وہ اعلیٰ مقام آتا ہے جس کو ہم معراج کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ معراج جہاں آیات کبریٰ کے مستبد، حقیقی اہل کی یافت اور قرب الہی کے کمال کی نشانی ہے۔ میں خدائی بشارت و نصرت کی نوید ہے جس کا ربط ساری تقدیر انسانی سے ہے، اقبال کہتے ہیں کہ ”وہ فی ہندی کے، مہی ترین مقام تک پہنچنے کے بعد ایک بی بی واپس تھکتی ہوئی ہے۔ پانچویں طلبہ میں اقبال کہتے ہیں ”وہ اس واردات سے واپس آتا ہے تو اس سے کہ زمانہ دی رو میں داخل ہو جائے اور پھر ان قوتوں کے طلبہ اور تہذیب سے جو تاریخ عام کی صورت میں مقاصد کی ایک نئی دنیا بنا کر رہے۔ اس طرح معراج و ہجرت میں ایک گہرا اور معنوی ربط ہے، سورہ بنی اسرائیل میں جس کا آغاز ہے ”تقداسی سے ہوتا ہے ہجرت کا اشارہ مل جاتا ہے، ایک نیا کارخانہوں سے نکل کر ایک نئی نشاء میں داخل ہونے اور طلبہ و نصرت کی بشارت ہے۔“

ہجرت کا پورا Process معراج کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ معراج کے بعد ہجرت مبارک سے یہ رہنویں مل سکتی ہیں کہ ایک قبیلہ خزرج کے ۱۶ افراد اسلام قبول کرتے ہیں، دوسرے سال یہ تقدیر ہو جاتی ہے اور تیسرے سال بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر ۱۲ اصحاب رسول اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور آپؐ کو مدینہ آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ بیعت عام طرح کی بیعت نہیں تھی بلکہ ۱۲ افراد کے اس گروہ میں شامل ہر فرد اس فیصلہ کے نتائج اور عواقب سے بخوبی واقف تھا۔ حضرت عباسؓ نے، معاویہؓ کا اسے شائب کے اوتوا پر عرب و عجم کے خلاف علان جنگ ہے، سنت خونریز لڑائی کو دعوت دینا ہے، اس وفد کے ایک رکن اسعد بن زرہ کہہ کر اس بیعت کے نتائج سے اپنے ساتھیوں کو یوں واقف کر داتے ہیں کہ ”ابو اہل شائب ہم لوگ اپنے پاس آئے ہیں تو اس لئے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج ہمیں یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ تم عرب کے دشمنی میں لینا ہے، اس کے نتیجے میں تمہارے ذنب ہال قتل ہوں گے، تلواریں تم پر برسیں گی، بعد اتم اس ویرانہ شہر کے قتل و قتل اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو اور اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ لیکن اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں۔ تو پھر چھوڑ دو۔ کیوں کہ اس وقت ہذا کرنا خدا کے نزدیک قابل قبول ہو سکتا ہے۔ اس بات کو بانداز دیگر ایک دوسرے رکن عباس بن عبد المطلبوں دہراتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ اس شخص سے کس پارے میں بیعت کر رہے ہو تم ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے دنیا بھر سے لڑائی مول رہے ہو۔“

جس ارقمہ بن خنیس کو ایک تہار کے موسم اور تہار کے شرافت کے لحاظ میں بڑا میں تھا
تم انہیں دشمنوں کے ہمارے سروں کے قہر سے آتش ہی انہیں چھوڑ دو، یہاں کہ خدا کی قسم یہ دنیا اور
آخرت کی رسوائی کے لیے تہار والا وہ ہے کہ وہ باوقار شخصوں کے رتبے ہو اس کو اپنے موسم اور
تراف کی عزت کے باوجود جہاد کے قتلے شکس کا ہاتھ تو ملو یہ خدا کی قسم اس میں دنیا و آخرت کی
جھلائی ہے۔

جب وہ قندسہ کے سردار کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنے املاک کی چابی واپس
شراف کی بدلتے ہوئے ممالک میں تیار ہیں تو تب تک یہ امت کی تکمیل ہوتی ہے اور تاریخی حقائق کے
انبار کے پائے ملتی ہیں جو بدھ بچے ہیں۔

میں نے بدلتے ہوئے تہار کے موقع پر اس سندھو کے پیش یا پستہ کے یہ بات اشیاء کو جس
کہ جو موت کا وہاں نے رکھ رکھی اس کے سر میں مدینہ کے اسے قبول کر رہے ہیں اور اسے جلیسی میں
لے لے کر سلطان بصرہ کے لیے اس کے جواب میں قبولیت اور خیر کے یہ سامان ہو رہے ہیں۔

اس نے جدوجہد کے متعلق ساری تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ مدینہ پہنچ کر مہاجرین کی
باڑا باری، مدینہ کے نواح میں آباء یہودیوں کی بستیوں اور دیگر قبائل کے معاہدے، اس
سارے مرحلوں سے رُک کر دنیا کی پہلی اسلامی مملکت کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ ان واقعات میں سے
ہر واقعہ اپنے اعتبار سے مندرجہ ذیل ہے۔ غصہ و کد کا یہ موقع نہیں ہے بلکہ یہاں میں ہجرت کی
حکمت اور اس کے چند انتہائی پیہوؤں کی جانب چند اہم اشارے کرنا چاہتا ہوں۔

یہ بات واضح رہے کہ ہجرت منس نقل مقام کا نام نہیں ہے، دشمنوں کے زور سے نکل کر کسی
مختص پناہ گاہ کی تلاش نہیں ہے۔ مصائب سے بچ کر کسی گوشہ مافیت کی آرزو نہیں ہے۔ بدھ تگمہ میں
سے نکل کر ایک ماسیہ اور ہمہ گیر انقلاب کے لئے ایک مرکز کی تشکیل کا نام ہے منتشر قوتوں کی تنظیم کا
نام ہے۔

اقبال کہتے ہیں:

پس چرا از مسکن آباء گریخت
تو گماں داری کہ از اعداء گریخت

قلم گویاں حق زما پوشیدہ اند
 معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
 ہجرت زمین دنیا مسلست
 اس ز اسباب تہات مسلست
 معنی نو ز تک سنی رست
 ترب ششم بر تہائیم رست
 بایست آہنگ تسخیر ہمہ
 تا تا کی ہستی فرایہ ہمہ

مسکن آباد سے مراد وطن ہے اور انسانی نفسیات کے مقہارت آدمی وطن کی محبت سے مراد اشار
 ہوتا ہے بلکہ زمین دیات کے مقہار میں اس کی اہمیت ثانوی ہوتی ہے۔ یہ مادی زندگی کا ایک مرحلہ
 ضرور ہے لیکن ابدیت کے وسیع تناظر میں ہجرت زمین پوششی (Earth Rootedness) کے
 سارے مفادات کو ختم کر دیتی ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ سلام کو زمین کے نالوں میں
 مقید نہیں رہا جاسکتا ہے۔ یہ مت مکان کی پابند space bound نہیں ہے۔ ہجرت کی بنیاد
 پر پندرہویں صدی قریب منانے والے عام اسلام کے بیشتر مکتبوں کے لئے ہجرت کا یہ پہلو کھل کر
 فراہم کرتا ہے کہ مسکن کا یہ تصور، وسیع تر امت کی تشکیلات میں جس سے اندازت خارج ہو رہا ہے۔
 اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نسل قوم اور وطن شناسیت کا اذریہ ہیں لیکن ہجرت کے ذریعہ اس اساسی
 اندیشہ کی بنیاد کوئی نئی روحانی و انسانی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے۔

ہجرت ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اسلام سارے کوئی رشتہاں سے جہی، اقربانوں کا نام ہے
 اس کی تشکیلات صرف کلمہ طیب کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ہجرت جی کی بات ہے کہ حضرت ام سلمہ اپنے شوہر
 اور تیر خوار بچے سے پھڑک کر رہ گئیں اور تقریباً ایک سال تک ان کی دلدادہ رہیں جس مقام پر بندہ ہوتی
 رہیں جہاں وہ اپنے بچے اور شوہر سے جدا کر دی گئی تھیں۔ عرب کے اس معاشرہ میں جہاں قبیلہ کے ہی
 قتل پر نسل در نسل بدلہ کا سلسلہ جاری رہتا کیسی انتہائی تبدیلی آگئی، اس کا اندازہ صرف ایک ہی
 واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ جو ہجرت کے چند ماہ بعد ہی غزوہ بدر کے مقام پر پیش آیا۔

خالق کی قوت و تقویت دینے کے لئے یہ حسب عملی اختیار کی جاوے۔ اس طرح غیر ہمدرد قوتوں و
 انہوں کا حریف بننے سے روکا جاوے اور ان کی خدائی تائید کیے نہ گھسی کی جاوے۔ یہودیوں اور دیگر
 قبائل سے یہ یہودی بد اثر است نبوی کا یہ اتنی نمونہ ہے۔

انہی ہی ذہب کے مختلف خیالات میں بنے ہوئے مسلمان مختلف متبادلاتوں سے بہرہ ور ہیں۔
 انہیں یہ سہارا پیش ہے کہ موجودہ صورت حال سے اس طرح نہیں، ہماری قوتوں صرف انہیں پر اتنی
 موزوں ہو جاتی ہے کہ ہماری قوتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ہماری مدت ہی کے ساتھ ہی ہماری صرف
 رہنمائی میں رہیں گی ان خدائی تائید ہمیں حاصل کر سکتے ہیں۔ کبھی بھی ایسے موقع پر جب کہ کسی چیز نے
 کتاب یا سماں کی پیدا نہیں ہوئی، اس کی سربراہی کا انتخاب بھی ہماری فرائض کا امتثال ہی ہوتا ہے۔ اس
 صورت میں یہ یہودی نہیں ہے۔ ذہب اسرائیلی قوتیں موثر اور متفہم ہو جاتی ہیں تو اندرونی تاجدار
 ساتھ ساتھ اپنے وسائل جو بیرونہ زمینیں استعماریوں کے ہیں ان کی نہیں پائیے۔ جلد وقت کے
 لئے یہ وقت و محسوس بھی برہان چاہئے تاکہ مخالف قوتوں کی سمیت کا اندازہ ہو سکے۔ یہ اس ایک
 لئے یہی سہارا نہیں ہے۔ بعد میں سے قوتوں کی شہرہ و مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ قوتوں کی توجہ
 تاجدار کی شہرہ و یہ قوتوں اس موقف و مشرکین مد پر غلبہ کر دیا۔ یہاں پہلے جنک بدر کے قتل بعد ان
 میں ذہب ہمہ کے لئے مدتشیف سے قوتوں کے اور از ویرا باجہل کے روک دیا اور یہ کہ قوتوں
 تاجدار کے ہاتھوں کو چاہئے ہو ان سے قوتوں اور نہت کا ہجرت ہو اور اس کے ہاں جو ہم یہ چاہتے
 ہو کہ ہم تمہیں ہمیں سے مد میں ملو گے۔ اس میں یہ مدد کے جواب میں کہا۔ تمہارے لئے اس سے روک
 دیا تو میں تمہیں اس چیز سے روک دوں گا جو تمہارے لئے اس سے شدید تر ہے (میں مدینہ سے تمہاری
 روک دوں گا)۔ جہاں جہاں مسلمان اس موقف میں ہیں یہ وہ اپنے اثر و مہم وقت و مدت سمجھنے کا یہ دلیل
 مسوئوں کو دیکھیں ان کے لئے ہجرت کی یہ خدمت عملی یہ کہ اگر وہ ہجرت کی ہے میں صورت حال یہ ہے
 کہ بیشتر ممالک نے تو اپنے خدائی داخلی انتظام پر متوجہ ہیں اور نہ اپنے وسائل کی قوت و خدائی نہت کے
 کے استعمال کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان نامہ ہاد مسلم ملک میں زور اس بات پر ہے کہ راجد سے نامہ
 اقتدار مل جائے تو کسی طرح ذاتی اقتدار کے استحکام کی کوشش کریں۔

میں نے نہایت اختصار کے ساتھ ہجرت سے متعلق چند اہم پہلوؤں کو پیش کر کے دی ہجرت کی

ہے۔ تو میں ایک بات کی طرف توجہ داتا ہوں کہ میں نے یہ کتابیں پڑھیں تو اس میں ایک بات ہے جو بدلتی رہتی ہے۔ اس بات کے اعتبار سے اس کتاب کی تالیف پڑھ کر ہمیں ایک نیا جہد کے لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہمیں یہ کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ ان میں سے ایک کتاب "مذہب و تمدن" ہے۔ اس کتاب میں اس بات پر بحث ہے کہ تمدن کی ترقی سے ہمیں کیا فائدہ ہے؟ اس کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے؟ اس کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے؟ اس کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے؟

نوید ہے۔ (سوشل ۱۹۸۱ء)

عقیدہ ختم نبوت کی تہذیبی قدر
فکر اقبال کی روشنی میں

(قبائلی سیدی بے تختی، ممبئی راشٹر اکے زیرِ اقتدار میں ۱۹۰۷ء میں پڑھا گیا)

اسلام میں حریت کی اولین شہادت یہاں ہاں ہے۔ ثانی یہ کہ اس میں بالکل 'سُپرناتُرا' (Supernatural) بات نہیں ہے بلکہ انسانی پر مسیحا علی کی موجودہ یہ بات و کتابت کی وہ رفیع کلمات ہیں جن میں ہم باور کی مدد و عقل کی رہائی نہیں ہے۔ مشاہدہ و علم کی اہلی سے یہ حینہ حقائق کی جانب کشی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ غیب، غیب کی رہنمائی ہے۔ یہ غیبی زندگی باطنی نہیں، مطلق۔ یہ غیبی ہمارے فکروں کی وراثت کا نئی زندگی ہے۔ ہمارے اعمال و ایمان کی بنیاد پر مقیم ہے۔ اس لیے اس کے متعلقہ کی تعبیر اور تفسیر۔ وراثت کی سہانی میں اس کے کلمات وراثت ہیں۔ اس کے بعد یہ خاص موضوع رہے ہیں۔ اس میں ہم ہمارا مہم ہے۔ انہوں نے ایمان و عقل کے پہلی تعلق کی وراثت کے درمیان توازن قائم کرنے کی وراثت کی۔ ایک یہ توازن قائم کرنے کی ہے وراثت کی۔ اقبال کے تراویح میں یہ توازن قائم ہے۔ اس میں اس ایک بعد از علم و عقل موجود ہے۔ یہی مشہور ہے کہ انہوں نے اقبال کے کلمات میں ہر فرقہ و فرقہ کو آتا ہے۔

مستفید کا ختم نبوت اسلام میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ نبوت کی ناقصیت کا تصور بدیہیہ تصور رہتا ہے اور حرارت سے جاری نہیں ہوتا بلکہ وہ تصور ہے جس کا اردی کارڈی اس سے رہائی حاصل ہے۔ زچہ شیدہ ہے۔ کائنات کی روشنی میں باخلاف ترمیم یہ بات کی جا سکتی ہے۔ یہ آخر کی نبی کی صفات و خصوصیات کی جانچ کے لئے جو بھی تحقیقی معیار رات قرار دے جاسکتے ہیں۔ یہ ذات رسالت مآب ﷺ کی یہ تہذیب پوری پوری اترتی ہے۔ اس عمل یہ تہذیب تہذیب جو ہر ماحول میں کیا۔ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس سے علاوہ خلافت انسانی کا تصور یہی ہے۔ یہ پر والہت کرتا ہے جو تکوین و تکلیف کا آخری نتیجہ اور تمام اعلیٰ و صلاحت کا منظرہ تمام مہیاں مستفید کرتے

ہاں الہامیاتی کے بعد ان دور الہامیاتی کی اس عمت محمدی ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت نامی نہیں ہندو کی ہے۔ یہاں کہ اس نبوت کے احکام میں فطرت ہیں یا فطرت کے خلاف خود نواری قبول کرتی ہے۔ فطرت کے خلاف انہیں خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام رندوں کی ہے۔ یہاں سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک احکام نہیں جن کو ایک متعلق اعلان حکومت نے ہم پر لایا ہے اور جن پر ہم بخش خوف سے عمل کرنے پر مجبور ہیں۔

اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ الہامی محمدی کے بعد ہی اور الہامی حیثیت میں ثانوی ہے۔ سلسلہ الہامی تو باری رہے گا۔ مگر الہامی کے بعد الہامی بہت نہیں ہے۔ اس شخص کے جس کو الہام ہوا ہے۔ یا غلط دیر الہامی محمدی کے بعد الہامی ایک ریاضت Fact ہے اس کا الہامی سوشل مشہور یا وقعت نہیں ہے۔

اقبال کے خیال میں نہایت ہی تمدنی تاریخ میں تمام نبوت کا میل سب سے اونچا ہے اور اس کا تعلق اندازہ مغربی اور وسطی ایشیاء و برادری Magian Culture کی تاریخ کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ وہ برادری تمدن میں زرتشتی، یہودی، نصرانی اور سب تمام مذہب شامل ہیں جن تمام میں نبوت کے اجزاء کا خیال نہایت لازم تھا۔ چنانچہ ان پر مستقل انتظار کی ضرورت طاری رہتی تھی۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ نئے مذہبی تجربات اور مہمات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس سلسلے میں حالات تھک رہے نبوت دانی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کسی مذہب یا مذہب کی تعریف سے متعلق نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں موجودہ ریاضت کے بارے میں ان کا نقطہ نظر ان صدوں کی تاریخ میں ہے کہ اسلامی دعوت کے یہ وقت و شانت کا وجود ناگزیر ہے اور یہ ہے کہ اس کا دار و مدار کی فرمایا افراد کی جو ہر قیوت پر ہی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان بات کو اندوہ موجود کے اختیار میں اپنے قوائے فکر عمل کو خواہید رکھا جائے۔

نعم نبوت کا ایک اور پہلو عقل ستارہ الہی کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہے۔ جب عقل نے اسے قبول کیا اور قوت تنقید بیدار ہوئی تو رندوں کا مفاہیم اس میں ہے کہ ابتدائی مراحل میں اس توانائی کا نیک رجحان اور اس کے عقل طریقوں سے ہوا تھا اس کا سلسلہ رک جا ہے۔ نعم نبوت کے چپے ہمارے نبوت ایک طرح کی کفایت فکر کا نام ہے۔

تقریباً ہر شے پر مکتوب تھا۔ اس اسلام میں ایمان اور عقل کے قورین کا نتیجہ یہ ہے۔ یہ لطف تو یہ دین بدی اصولوں پر قائم ہیں اور لطف و خوبی اپنی جدید و احیاء کے ذریعہ حاصل ہے۔ اس طرح کہ اس میں روح مصر کی عکاسی ہوئی رہے۔

تقریباً نبوت کا بک فینڈاں کی امت کی تشبیل ہے جو نہ Space bound مکان کی پابندی سے اور نہ Time bound زمان کی پابندی سے اقبال شہر نبوت و ملت ملامت پر ایک احسان تصور کرتے ہیں۔

پس خدا پر ما شریعت ختم کرو ہر رسول ما رسالت ختم کرد
رواق از ما محفل ایام را او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمت مہائی بری ہوا مذلت وہا را شہریں حٹ کے داشت
"انہی بعدی" از احسان خداست پہلو کا مہیں دہن مہش است
(رموز بے خودی ص ۱۱۸)

یہ ملت نہ تو کی خاص رودت و بست ہے ورنہ کی خطہ ارش سے اور نہ اس کی حیثیت کی Closed entity کی ہے بلکہ ساری اسامیت کا تعلق اس کا منصب ہے چونکہ اس منصب میں تدریجی مگر مادی انتاب کی طرف مسلسل معبود ہے جس کی طرف اقبال نے اتنا رویا ہے اسی لیے اس کو دوام ہے جو نرو اس چیم کو قہار نے ادیت خدا دیتا ہے و اپنے دور کے تمام شے سے غافل ہو کر جمود کا شکار ہو جاتا ہے تو یہ حالت اس سے نہیں کہ دوسروں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس وقت مہائی اور زمانی تسلسل باقی رہتا ہے اس کا جوہر کی تمام سے وابستہ نہیں ہے۔

جو ہر ما با مقامے بست نیست بادو تمدش بہ جامے بست نیست
ہندی و چینی سہل جام دست قلب ما از بند و روم و شہر نیست
مرز و بوم ما بجز اسلام نیست

(رموز بے خودی ص ۱۲۹)

یہاں اقبال نے واقعہ ہجرت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس کی پیش توہیوں کی ہے

۔ جو تباہ کن آسمان کے اندر سے پڑنے کی خوشی نہ تھی بلکہ دراصل یہ زمین پر تھی۔
Earth rootedness۔ خلاف یہ نہیں، درحقیقہ اس کا جو مطلب ہے رتبہ آبی کے
 گزر کر تسخیر سیم کا نام ہے۔

پس چرا از مسکن آباء گریخت تو گماں داری کہ از اعداء گریخت
 قصود گویاں حق زما پوشیده اند معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
 ہجرت آئین حیات مسلم است اس ز اسباب ثبات مسلم است
 معنی آواز تنگ آبی دم است ترک شبنم بہر تسخیر سیم است
 بایست آہنگ تسخیر ہمہ تا قوی باشی فراگیر ہمہ
 (رموز بے خودی ۱۳۱)

قید دہانی کے آواز کی یہ صورت خود اپنی تجدید و حرکت کے ذرائع کی حامل ہے۔
 یہ حیاتی اعتبار کے لئے نہیں ہے جو تے اور فنا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن مسکراتی رہتا ہے جس میں
 یہ ملت اُٹھ کر اس دور کے افراط و تفریط نہیں ہوتا اس کے یہاں ۱۹۱۵ء ہے۔

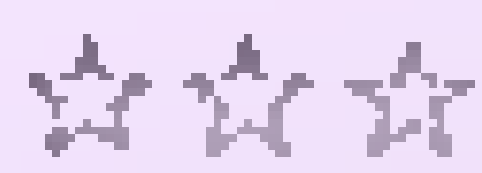
از اہل اس قوم بے پرواست استوار از سخن تزلزل است
 ذکر قائم از قیام ذاکر است از دوام او دوام ذاکر است
 (رموز بے خودی ۱۳۷)

اس صفت و رتخ اس بات پر بھی یقینی ہے کہ نتائج بات کے ہجوم اور داخلی و خارجی
 نمودوں کی زد سے یہ صامت بن چکی ہے۔ طاقت و توانائی کے لئے اس میں شامل ہونے
 اس کی روانی کو برقرار رکھتے رہے ہیں۔

تشنہ تاتاریں نظر نیست شعلہ ہاں نہ گل دستار نیست
 از تہ آتش بر اندازیم گل نار ہر نمود را سازیم گل
 شعلہ ہائے انقلاب روزگار چوں بیاباں ما رسد گردد بہار
 (رموز بے خودی ۱۳۸)

اقبال کے یہاں کے شعلہ میں یہ کرب و اضطراب جھلکتا ہے کہ وہ گروہ جو جس پیام

آخریں سے اپنے آپ کو ہٹا جھٹکتا ہے، وہ نثر نہایت کے نتیجہ میں زمان و مکاں سے آزادی کے
 اس مشہور سے پرچند و رگد ام و حرکت کی صلاحیت سے عاری ہو چکا ہے۔ زندگی جہاں ارواں
 وہاں ہے، اقبال نے بتایا کہ بات کی قافی ابدیت میں سنوں کی تلاش نہیں بلکہ اسے حرکت و تغیر
 سے مرمت بھی آکا ہوتا ہے۔ چنانچہ قبال کہتے ہیں: اسلام کے اس بنیاد کی تصور کے پیش نظر کہ
 وہی چاروں ہمیشہ سے بند تھے لہذا اب وہی قافی نہیں کہ ہم اس کے مختلف ٹھہریں، تہا کی بند
 دین کی قوموں میں ہونی چاہئے جو روئی اختیار سے سب سے زیادہ آزادی حاصل کر چکی
 ہوں۔ شریعتوں کے مسلمان تو جہوں سے ایسیا قبال اسلام کی روئی خدائی سے نہایت
 ناسل کی قافی۔ اسلام کے اس تصور کی ٹھیک حقیقت بحث سے قدام رہے۔ لیکن ہمیں چاہیے کہ
 قافی اپنے اس مختلف کو سمجھیں، وراپنی حیات اذہم کی از مرثیہ شیل اسلام کے بنیاد کی اصولوں کی
 زمین میں قائم اس کی، و غرض و حیات جو ابھی تک سرف جزو تہا کے ساتھ آئی ہے قافی
 اس روئی تصوریت کا تصور و منتہی ہے تکمیل و پہنچ سکے۔ ۲



حوالہ جات:

- (۱) خطبات و ترجمہ سید نذیر یار کی، صفحہ ۲۲۳ (۲) منہ میں اقبال،
- مرتبہ تصدیق حسین ثانی، صفحہ ۱۸۳۔ (۳) انوار اقبال، مرتبہ بشیر احمد راسخو
- ۶۵۔ (۴) خطبات، صفحہ ۱۹۰ (۵) نسبت، صفحہ ۸۸۔ (۶) حرف اقبال، صفحہ
- ۳۶ (۷) منہ میں قبال، صفحہ ۱۵۴ (۸) انوار اقبال، صفحہ ۴۶ (۹) نسبت،
- صفحہ ۱۹۶ (۱۰) خطبات، صفحہ ۱۹۳ (۱) انوار اقبال صفحہ ۴۸ (۱۲) خطبات،
- صفحہ ۲۷۶۔

امت میں اختلاف رائے کے آداب و حدود

اسوہ حسنہ کی روشنی میں

آپ کے دور میں، ماز پور، نامہ افغانی، تاجیکان، تاجک اور غیوری، تاجک،
دہلیویں، سندھ، پنجاب، سندھ، قافلہ ہا کے حدی حواں ہا ہیں، تاجکوں نے یہ بھی
کہا ہے کہ یہ تاجک۔

منزل راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے ؟
قیامت کے دن یہ قیامت ہیں، حسب اور حسب عارۃ فی ہیں۔ یہ قیامت
درست ثابت ہے، یہ سہاٹیں ہے، یہ بھی ہے، یہ قیامت ہیں۔ یہ قیامت کا سلسلہ جاری رہتا ہے
لیکن صورتحال یہ ہے کہ۔

میر سپاہ نامزدا لشکریاں شکستہ صف
آہ اوہ تیرنیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

یہ قیامت کے دور میں رہا ہے۔ ایک دور ہے کہ ٹیٹو کو تھکے میں رہا، نہیں
موجود رہی ہیں۔ میں، میں، میں ہے۔ اختلاف ہے کہ چاروں حدوں میں کیا ان حدوں میں
رہا تھا، اختلاف ہے، اختلاف میں رہا ہے۔ آپس میں ذاتی معمولوں کو رد کر دیا ہے۔ یہ
یہ مسئلہ چھٹی ہی نہیں ہے، اس کی وجہ سے ایک تھیم کی لائن میں جہاں اور مذہب اور ثقافت
نہیں رہے، یہ بھی ہے، یہ راہنمیں صورتحال کو نوادہ کر سکتا ہے۔

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں؟

موجودہ تناظر میں، مسلم قیامت پر قبل کا یہ تبہ بڑا چمٹا ہے۔ "علامہ میں مدح و ستائش
ہے۔ یہ روایت حق کے سے اترتا ہے۔ معافی، علامہ سے ہے، پرہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔
انبار نویس، وراثت، علی، قیامت، لیڈر، خود غرض ہیں اور ذاتی منفعیت اور عزت کے سوا کوئی

متعدان کی زندگی کا نہیں۔ عوم میں جذبہ قوم جو ہے مران کا ملی سب غرض رہنا نہیں ہے۔“
(مکتوب اقبال ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء) اقبال نامہ ۲۴۹)

اس کا خوشگوار ارتعاب دواور دیکھ بھری باتوں وطلوں میں متسوا نہیں ہے۔ اس صورت
جس سے اوردادوں کی بھی ہیں جو کی رعایت کی روایا کی تنظیم کے اردب است و شہا ہیں۔
سن میں ش کے نزدیک سہ و قہقہ، وسعت فکر، عمل شاید سب معنی خاص ہیں یا ہوں بھی توان کی
نی کامیاب ت اور مشق سلجھا کے جانے الجھا و پیدا کرتی ہیں۔ دود کی دود میں جو
قیادت کے نی اختلاف کی بنیاد پر اپنی صورتوں پیدا کر دیتے ہیں جو وہ نہیں رہتی جاسکتی۔ وہ یہ
اور اس سے ہیں قیادت کی عقلی کی سان ان پر فرض ہیں ہے۔ کثر صورتوں میں اس اختلاف کی
پیوہ و پناہ پسندی ہوتی ہے۔ اپنی رائے کوئی شکی و درست ہمہ اپنی رائے پیش کرنے سے
قد اس اتنا کہ بات اختلاف سے بڑھ کر افتراق تک پہنچ جائے۔

متعدان فرہم مسد میں قیادت ان بید سے تمام ارتعادات و برحق مانتا ہے۔ ان کی تعلیم و تہ
ت و اس سے نسبت نہیں ہے۔ سادہ و سادہ تنظیم نہیں، ادب و تعمیل مانتا ہے۔ اس بات
رائی کے بہت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس لئے اس سے غیر جانبدار نہ و غیر جذباتی انداز کے
نیک نیتی سے ہدایت کے ان بدی مریضوں سے رجوع کرتے ہوئے اپنی سب کچھ قیادت نہیں
رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔

پہلی بات قیادت کے لئے قیادت کا رخت نہیں ہوتی۔ قیادت شہر کی جاتی ہے
وہائی نہیں جاتی۔ کہا یہ ہے سید قوم خاتم۔ (قوم کا سردارن جانی و مانتا ہے) قیادت نفس
وہانت کا نہیں، قیادت نفس خفاہت کا نہیں۔ قیادت کے قیادت کے وصال کے بعد میں
بیان کئے تھے۔

نکہ بلند، سخن دلنواز، جاں پڑ سوز

یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

ایک اور مقام پر اقبال نے کہا تھا

چہ باید مرد را طبعے بلندے، شربے نالے

یومہ بن گئیں تھا کہ معاہدہ کے شرٹ سے دست بردار کر کے کاغذ لکھ رہا تھا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے بدسلوک ہو کر فریاد ہو چکے تو سب سے فرمایا اٹھا اور اپنے اپنے چادر کی قربانی دے دو۔ لیکن وہی آواز نہ ہو۔ دیکھتے تھی مازب صورت حال تھی۔ چہ آپ نے ام المومنینؓ سے ملنے کے لئے صرف یہ خدمت ام سلمہؓ سے مشورہ کیا کہ آپ کسی سے چھوٹے بغیر اپنا چادر فریاد کر دیجئے اور رہنمائی دیجئے۔ آپ کے سبب سے ملنے والے چھوٹے چھوٹے سبب سے ملنے والی۔ اسی سبب کا ایک اور قیودہ ہے کہ میں ممالِ خیمت کے موقع پر انصار کے نو جوانوں کا انتداب اور رنجیدگی ہے۔ منظور رہتا ہے کہ قریشی اور قبائل عرب میں ممالِ خیمت تقسیم فرمایا۔ اور انصار کو دینا دیا۔ اس سبب سے پیچھے تائید لیکن اور ایک خاص صورت عملی پوشیدہ تھی کہ انصار رنجیدہ تھے وہ اپنے دل میں بیچ و تاب کرتے رہے اور چہ میسر ہو یا نہ ہو رہے تھے۔ اس کی اطلاع سب انصار کو پہنچی تو آپ نے انصار سے براہِ خدمت سعد بن ہاشم سے فرمایا کہ انصار و ایک خیمہ میں اٹھ جائیں۔ اس سبب سے ایک جہاد ہوئے تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ سب زبان رسالت مآب ﷺ نے جس خیمہ میں براہِ رسالت مآب سے خطاب فرمایا وہ یہ تھی کہ ایک درختوں کا سایہ ہے۔ آپ نے اللہ کے نام پر قیام کیا اور کہا کہ بعد فرمایا۔ اسے انصار کے لوگوں نے تہا رہی یہ کیا چہ میسر ہوئی ہے جو میرے نام میں گئی ہے۔ اور یہ کیا دراصل ہے جو قیام ہی میں تم نے مجھ پر محسوس کی ہے؟

اب دیکھئے اس طرح انصار کے دوس کو آپ نے دینا دیا؟ آپ نے فرمایا یا ایہا نبیین ہے کہ میں تمہارے پاس اس حالت میں آیا تھا کہ تم ٹراہتے "اللہ تمہیں میرے ذریعہ سے ہدایت دیں اور تم کو توفیق دے اللہ نے تمہیں توفیق دینا دیا۔ تم باہر تھن تھے اللہ نے تمہارے دل جوڑے، دوسروں نے کہا کیوں نہیں؟ اللہ اور اس کے رسول کا بڑا فضل و کرم ہے۔

اس کے بعد حضور کریم ﷺ نے فرمایا انصار کے لوگوں نے جواب دیوں نہیں دیتے۔ "انصار نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! بھلا ہم آپ کو کیا جواب دیں، اور اس کے رسول کا فضل و کرم ہے۔ اب آپ کے دلوں ہڑپاؤں نے والا خلیفہ ہے آپ نے فرمایا دیکھو اللہ کی قسم ہر تمہارا ہوا تو بہرہ سکتے ہو۔ ورنہ سچ ہی ہوئے اور تمہاری بات سچ ہی مانی جائے گی۔ تم ہو کہ آپ ہمارے پاس اس حالت میں آئے تھے کہ آپ کو جھٹکیا گیا تھا ہم نے آپ کی تعزیت کی۔ آپ کو بے درمنا ہوا

نہیں دی۔

کتنی باتیں ہیں جو عرض کی جا سکتی ہیں۔ رہاں کہا دینو اور ذہن فطرت کو قبول کرنا چاہتا
ہاں رہا قلمی مدت کا وہ ہو اور مسلمہ مدت کے خلاف ہونے والی سازشوں کا احساس ہو تو وہ راز وہ یہ
مقدس ہو جائے۔ فرہنگ حکومتوں کی کوشش ہوتی ہے کہ امت کے اندر اختلافات پیدا کئے جائیں
اور انہیں دورانی جائے۔ اس مقصد کی تمیل میں وہ ایسے افراد بونین جتنی ہیں جو ان کے متی صدلی
تمیل میں مدد دے سکیں، ان کا آئے کار بن سکیں اسے، فراوانی مالیات اور عزت سے
نوازتے ہیں۔

ان باتوں سے تذکرہ کا مقصد یہی ہے کہ کاہم مدت کی نزاکت نہ سمجھیں۔ دور دور
والی قدر، شمس کے ہاتھ مضبوط کرنے کا سبب نہ ہے۔ یہ تو ہوتا ہے کہ ہم خود، نادرہ، تشدد
سے بچیں۔ وہ لوگ جو خواہی یا نہ خواہی قیامت کے منصب یرقی بڑھیں، بجائے ہٹ ہٹائی کے ہاتھ
مشہورت سے نیت و تمہیں جس کی تاکید قرآن مجید میں آئی ہے۔ انھوں نے ہم کا فرمان سب جس
سے مشہور ہے یہ امت نہ مت نہیں ہوتی۔ رہنا ہے رب کی باتیں تو ہوتی ہیں لیکن یہ رہنا ہے رب
سے ہم پر ہمارا مختلف فرقہ بڑھا دیتا ہے تو تمہا یہ یہ ضروری ہو گا کہ ہمارا خدا پرست ہو کر
امت کی فلاح کے احیاء سرے کام ہیں۔ جس طریقہ کار اور کام وہ آپ درست سمجھتے ہیں اس
و اپنی بسا اور مصداقیت کے مطابق نبی مہینے کی کوشش کریں۔



میں بد اقبال کی تہا میں وہ اقبال آئندہ جلوں پر تر اندر رہا کرتے رہیں گے۔ اقبال کی قسمت و
برکت ہے کہ مختلف دوس کے مختلف معیارات مقرر کر رکھتے ہیں۔ اپنے اپنے بد اقبالیات
کے پس منظر میں ان کی فکر کی گویا بات کی باقی رہی ہیں۔ میں ہمارے زوایاں ان کی قسمت و
برکت و کامیابی سمیت اس سے کہ وہ سرمدی ابدی صداقتوں کے عجب دار ہیں۔ یہ وہاں
میں کہ قلم بردار میں کی جائے وہاں باقی کے پس منظر و پیش یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ
چاہتا ہوں کہ اقبال ہوں۔ اقبال نے ہمارے دل میں روشنی میں شکتی کی روشنی دی ہے۔

ہم سے قبال کی ہستی ممکن ہے کہ نہیں تھی۔ وہ ایک پیدائشی مسکن تھے بد
انہوں نے اپنے ہمارے خصلت اب ہمارے چھٹی کا ہونے کے لیے ہمارے قلوب کے لیے
انہوں نے گہرا مطالعہ کیا۔ ان کا یہ دعویٰ شاعرانہ تعالیٰ نہیں۔

مذہب و اس کا شہر سے باخبر میں ہیں اس سے ہیں یہاں میں نہیں
ایک اور موقع پر انہوں نے کہا۔

شوق میری لئے میں ہے شوق میرے لئے میں ہے

تخمہ "اللہ ہو" میرے دگ وپے میں ہے

انہوں نے انکی سہ ماہی ہوتی نہیں یہ انہوں نے کیا ہے کہ وہ انکی سہ ماہی ہوتی نہیں
نے یہ وہی یا مسندیات مدہن کیا ہے بد اقبال نے ہمارے قلوب کے پیغام کو اپنے ہمارے
تلاشوں کی ہستی میں پیش کیا ہے۔ ہمارے میں کے مسائل براہ راست ہیں۔ انہوں نے ہمارے
میں اور نہ ہمارے اس بات کی راقی ہے کہ ہمارے تلاشوں کے وہاں صداقتوں ہمارے
نہ ہمارے پیش کیا ہے۔ قبال نے بھی اپنے ہمارے تلاشوں کی کاہلی کا کیا ہے۔ وہ اقبال
کی زندگی میں قبال پر مہتممات کے جاتے رہے۔ ہوں نے ان کے ہمارے ہمارے
قدوں میں ہمارے تلاشوں کی سے ورتائی بھی ایک مہتممات میں وہی کی ہیں وہی سے۔
ہر بڑا تلاشی ہمارے ہمارے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے ہمارے ہمارے ہمارے۔ اقبال نے
ایک آزاد ہمارے رکھنے والے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے
صداقتیں انہیں ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے ہمارے

دہلی میں کوئی جہنیش نہ ہو۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

ہوئے کس درجہ فقہانِ حرم ہے تو توفیق

حق و سچ ہے، اعلیٰ منزلت کی حالت کے نزدیک قبول کے پیراموں میں نہ رہا، سوا میں حقیر و
مستحق نہ ہو جس کا بیخود و متعصب نہ جس طرح قبول کی باتیں و حق و راستہ کی بات میں کوئی تشابہ نہیں
ہو گا۔ بلکہ اس کے قبول کے اعتبار سے اس بات میں کوئی تشابہ نہیں ہے۔

[illegible][illegible]

امریکات یہ ہے کہ اقبال نے امت مسلمہ کو یک نسب اچھی امت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک امت اسلامیہ کی بناء اس کے ضروری ہے کہ اس کے غیہ میں حریت و آزادی ہے۔ رنگ و نسل سے بیزاری ہے اور ابھی اس کی خاکستری میں وہ چمک رہی ہے جو ہے جو ایک شعلہ جوالہ بن کر زمین و آسمان کو جلا سکتی ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک عمدہ اضافہ کیا جو اب بے حد ہو کر رہا ہے کہ یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن میں اس محبت کی وجہ سے میں نے مسلمانوں کو اپنا منسوب نہیں کیا بلکہ اس نے کہا کہ یہاں ہم امت میرے متا صد کے مسلمانوں واقع ہوئی ہے۔

اس سلسلہ میں اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ امت اسلامیہ سے اقبال کی محبت ان کے مسرت اور نرم و برہمی منصبیت کا نام نہیں ہے۔ انہوں نے جتنی بڑی تنقید، غیہ تحت و مندرجات، تہذیب پسندی و رریت پرستی پر کی ہے شاید کسی اور نے کی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ امت اسلامیہ کی بہت بڑی باتوں سے بولے ایک نے جہاں کی قیاس کے ساتھ کرتے ہیں اور اس کے وجود و مریانی کا نام کے لیے یہ منقرض کر دیتے ہیں۔

میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے
میرے لٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے غندک ماتوں و اپنی بانگ درا سے دکھایا۔ ان انسانوں کو جو سنی، ممالی، رچی کی کا شکار ہو کر اپنی خودی کو بیٹھے ہیں اپنے آپ کو پہچاننے کی اپنی شناسیت و تعظیم کرنے پر زور دیا۔ اس لئے وہ انسانیت سے وہ یہ تو قی و راستہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے موقف اور مقام کی بازیافت کر کے دوسری اقوام کے لئے ”شاہد“ بن سکے گا۔ اقبال کی شاہکار نظم مسجد قہر و پڑے جیسے جوش و خروش، تاریخی بصیرت، رچی ویت اور فکر و رسا کا حسین امتزاج ہے۔ اس نظم کے آخری دو بند خاص طور پر قابل غور ہیں۔ جس میں اقبال نے مغرب کے انتہا بات پر یک نواہ نظر ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ ملت اسلامیہ کا موجودا شہر اب ایک نئے انتخاب کا پیش خیمہ ہے۔

فکر اقبال کے چند امتیازی پہلو

(۹ جون ۱۹۷۳ء کو نوجوانوں کے اجتماع کی دوسری نشست میں)

کی گئی ایک تعارفی تقریر کی تلخیص)

”جدید کی فکر اسلامی کی تشبیہ میں قبول کی جا رہی ہے (میں نے پیشی سنو میں یہ بات سن لی تھی کہ) نئی فکر بنیادی طور پر قرآنی ہدایت سے مستفید رہی ہے ایک سائنس اور امت مسلمہ کی رشتہ داری کی حیثیت سے انہوں نے اپنے دور کے غم و غم اور غم و غم پر غور کیا ہے۔ اور اپنے دور کے تناقضات کی روشنی میں انہوں نے نئے انداز سے اسلام کے چند پہلوؤں کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔“

قبول کی فکر اسلامی کا پہلا اہم پہلو متام نہان کی بازیافت ہے اور اسی کی روشنی میں ان کے پیرو خودی، خواہ فراموشی کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اقبالیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اقبال کا شعر ہے ”مثنوی اسرار خودی ہے“ یہ اس وقت شائع ہوئی جب کہ پہلی جنگ عظیم کی ہولناکیوں نے دنیا کو اپنی پیٹ میں سے لیا تھا۔ اس وقت کا دستور پر ماری انسانیت اور خدائے نور پر طعنے لگنے کی نیکیات کو اقبال نے محسوس کیا اور ہر جگہ انہیں انسان کا انکار نظر آیا۔ انسانیت بوجہ ظلم و ستم کی دنیا میں ایک طرف جیسے ہیٹ کا عقیدہ تھا جس نے اس دنیا کی زندگی کو آدم کے گناہ اولین کا نتیجہ قرار دے کر بنیادی طور پر طرف انسانیت کو بھروسہ کر دیا۔

بدیہیت نے ترک آرزو کی حلیم دے کر قوائے عمل کو معطل کر دیا اور بندہ امت کے تصور کو مٹانے میں نیا میں انسان کے ارادہ اور اختیار کو بے مقصد بنا دیا۔ مذہبی فکر سے ہٹ کر دیہی نظریات نے بھی انسان کو انسان نہیں سمجھا۔ کہیں فرائیڈ کی نفسیاتی جبریت نے عہد مثنویت کے شعوری ارتقاعات کو اس کے عمل کا متعین کرنے والا قرار دیا۔ کہیں وہ معاشی و جوب کے درمیان

یہ سب میں مصون رہی یا۔ کہیں، بقائیت پسند مادیات دانوں نے نہا یہ وہ سب مادیوں کا
 پروردہ نہیں یا یہ انہوں نے انسان کی خرافات سے آگاہ ہو کر دیکھتی ہے۔ کہیں روحانی قدروں سے
 مدد کی ہو، اس وسیع اور عیش و نشاط میں انسان کی حیثیت یہ ذرو بہ متعدد روحانی غرضیں۔
 خدا انسان و انسان کی خود ساختہ ریتوں اور قوانین کے گھوم رہا ہے۔ ان شخصیات کے تجزیہ میں
 اور یہ سب کے قائل یہ خداوند عالم کے ترقی سے محروم ہیں اور خصوصاً ملت اسلامیہ و سب ان کے
 محروم ہیں۔ خصوصاً ملت اسلامیہ کے خدا انسان کی خرافات اور خودی جس طرح مجروح ہوئی ان کی
 عکاسی کیلئے اقبال کا یہ شعر ہی کافی ہے۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری

اے کھنڈ سلطانی دہائی و پیری

اس میں منظر میں اقبال کے محسوس یا کہ اپنی حیثیت سے سب خیر انسان و خودی و خداوند
 ماننے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے اندر خدا کی وحدت اور وہ سب حیثیتوں سے واقف ہو سکے
 ۔ انہوں نے یہ دیکھا ہے۔ "اقتا پٹی خدائی صوبہ کا ہے"۔ مولیٰ ہوئی ہے کی جتنی نور و پیرندہ سب کے
 متعلقہ ہیں۔ عام کے خدا کے ساتھ انسان کا قیاس یہ ہے۔ قرآن مجید میں رہتا ہو سے
 ۔ انسان و انسان تو یہ بیدار یا ہے۔ اس کے قریب میں خدا تعالیٰ نے اپنی روح مصطفیٰ اور
 قدرت کی اس کے خرافات کی تہلیل دہائی ہے۔ قرآن مجید کے اسی شرف انسانیت اور شرافت کو
 کے پہلو و اقبال نے اسے شہدہ کے ساتھ اپنی شرافت اور عظمت میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے
 قرآن مجید کے قہر آمد کی روشنی میں واضح کیا کہ انسان اس کائنات میں خدا و روح کے ساتھ
 نہیں پیدا کیا۔ خدا کی جبر کا ایسا بے بندہ وار اور اختیار کی مانت کے ساتھ مکتوب ملک
 ہے۔ گویا ماری کائنات میں وہ خدا کا تاب ہے اور اس کا فرض ہے کہ اس پر حکمرانی کرے۔
 اقبال نے ان کے افکار پر بڑی تہیہ دی ہے جس نے انسان کی عظمت اور اس کے متواضعیہ کو
 خدا دیا۔ خود مسلمانوں کے اندر سرایت کرنے کے ایسے سارے رجحانات پر انہوں نے ضرب
 کمانی جس نے انسان کی خودی و مجروح کر دیا۔ اسی بنیاد پر انہوں نے مصطفیٰ و ملک کی بعض مادیات
 کو اپنی عقیدہ ثابت نہ بنایا کہ ان کی جہاد اور بے روح تعلیمات نے مسلمانوں کو بے عمل بنا دیا اور ان

ن تاویلات نے دنیا پر ری اور کشش حیات سے مرید پر آمادہ کیا۔ ہر کی ظاہر پرستیوں نے
 فہم سے اور خواہ کا اسیر کر دیا اور غیہ حیات مند سوچا نہ انکار سے حرمت و حیات سے عاری کر دیا۔
 قلوب نے ہر دور و دوری انسان کے لئے مرقہ قتل ہے جو اس کی خودی کی نشوونما کو روک دے۔
 یہ حسرت مہوتی، یہ عمر ایہوتی، حرم کے درد کا درماں نہیں تو پتہ بھی نہیں
 یہ زہر نہ مرنے، یہ مرقہ یہ مراد: تری خودی کے گہاں نہیں تو پتہ بھی نہیں
 اقبال نے تقدیر کے بارے میں ان غیر تصورات کے خلاف آواز اٹھائی جو انسان کو بے
 عمل بناتے ہیں۔ اس طرح تقدیر و رقمت کے نام پر انسان کے قلوب کے عمل کو منہ بون کر دیا
 فطرت انسانی پر بڑا ظلم ہے۔

تیرے دریا میں ملافان یوں نہیں ہے خودی تیری مسلمان یوں نہیں ہے
 ثبت ہے شعور و تقدیر یزداں تو خود تقدیر یزداں یوں نہیں ہے
 غرض اقبال نے نزدیک خودی کا اور اس کی تربیت اور تکمیل ہی جدوجہد حیات
 ہر مقصود اور خالق کائنات کا مطلوب ہے۔

خود بینی کی انتہا و نہائش ایک مراقبہ اور عزت کا نام نہیں بلکہ وہ اجتنابیت کی زیریریدون
 پناہی ہے۔ معشرہ اور ماحول کے تصادم کے درجہ بڑھتی ہے۔ اس کے اپنے ماحول اپنے
 معشرہ کے ساتھ بے نیازی اور ریزہ سلام کے اندر نہیں۔ اقبال کے نزدیک خودی اپنی ذات کا
 ملافان ہے۔ مرقہ کے ساتھ مجاہد کا نام ہے ورر بڑھامت کے ساتھ ہی اس کی تکمیل ہوسکتی ہے۔

فرد را ربط جماعت رحمت است

جوہر او را کمال از امت است

امت شیخ عبد القادر جیلانی کے ایک قول کے مطابق ہر ایک امت و ملت سلوک طے کرنے
 کے بعد (یعنی تزکیہ و تربیت کے بعد) حقوق کی جانب، مورثین اللہ ہو جاتا ہے۔

یہ بیغ اشارہ ان کے نام لیوؤں کے لئے قابل غور ہے جنہوں نے خائن بنی ظالم کی
 اصل عظمت اور اہمیت کو گھٹا دیا۔

اقبال کی فکر اسلامی کا ایک اور امتیازی پہلو ان کا تصور رکبت ہے۔ اس تصور رکبت کے

سہیلی انفرادی حرکت اور رہنمائی کے لئے محمد و امکانات یہ بہ کر واضح کر دیے گئے
کہ خدا کی تہذیبی منزل ہے۔ یہ بھی مختصر ہوئے! مسلسل سفر ہے۔

ابتدائی زندگی میں حرکت، متعدد جہلیں و درجے حسب العین کی بدولت پیدا ہوتی ہے جس کو
قبال نے آروہ نام دیا ہے۔ سماجی حرکت کے لئے اقبال آروہ کی نشوونما کے ساتھ ساتھ تہذیب
اور پادشہ داری خیال کرتے ہیں۔ ہائے را کی مشہور نظم ”ارجماء“ کا یہی مرکزی خیال ہے۔

تین و تار رہا ہے اس سے تا امروز : چراغ معشوق سے شرار بوجہ
شیش و سوراخ و تراش و تراش : زلف تیرہ دروں قابہ پیشہ طلبی
یہ شیش و سوراخ سے زندہ ہیں اقوام : یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی
قرآن مجید نے فطرت کے بشارت منجہ و خدا کی نشانیں قرار دے کر ان پر غور و فکر کی
وجہ دی ہے۔ ایک ممتاز اقبال نے روح ارجمی کی زبانی اس حقیقت پر توجہ دلائی ہے۔
ممکنات کا امتحان قرار دیا ہے۔

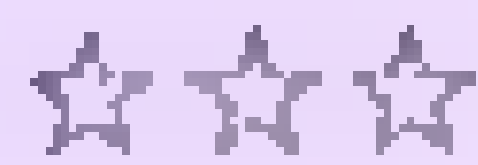
یوں تیرے تہذیب میں یہ بادل یہ تنہا میں : یہ کعبہ فاس سے یہ خاموش انسا میں
یہ وہ : یہ حیران، یہ سمندر، یہ ہوائیں : تینیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادا میں
آئینہ ایام میں آج اپنی را دیکھ

قرآن مجید میں ارشاد ہوا کہ اس نے ساتھ ساتھ انسان کو مع اور بھر بھی دلائے ہے تاکہ
انسان فہم و مشاہدہ کر سکے۔ ایک اور مقدم پر باب دانش، حکمت کی یہ نشانی بتاتی ہے کہ
وہ نکتہ دیکھتے، چلتے پھرتے اور لیٹے ہوئے خدا کا ذکر کرتے ہیں اور تحقیق ارشاد و مساوات پر غور
کرتے ہیں۔ دوران کا یہ غور و فکر، انہیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ کائنات میں کوئی چیز کے کار نہیں
پیدا کی گئی۔ گویا انسان کا کام ہے کہ غور و فکر و تحقیق، جستجو کے ذریعہ کائنات کی ہر شے کا عمل و فعل
مرے ارمان سے استمداد کی راہیں نکالے۔ اس پس منظر میں اپنے خطبات میں اقبال نے ایک
مقدمہ پر لکھا ہے کہ طبعی اعتبار سے نمل صالح کا مفہوم اس کے سوا چھو نہیں کہ فطرت کے موجد و
مستمر و ملاحظہ یا جانے اور انہیں زندگی کے اتنی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ جان کے
ساتھ آفاق کے مظاہر کے بارے میں انسان کا شعور جتنا بڑھتا جائے گا اتنا ہی دوحرفوں رب کی نئی

منزلوں سے ہم کنار ہوتا جائے گا۔

قبول سے رہنمائی میں تخیل فطرت و ذات مسلمہ کی توسیع کا سبب اور اس سے
ممکنات کا امتحان قرار دیا ہے۔

کوہ و صحرا ، دشت و دریا ، بحر و بر : تخیل تعلیم اسباب نظر
اے کہ از تاثیر اقیوں کشف : عالم اسباب را دوں گفت
خیز ، واکن دیدہ مخمورا : دوں مٹواں ایں عالم مجبور
مائش توسیع ذات مسلم است : امتحان ممکنات مسلم است
مسلمانوں کے وجود و احوال کے پس منظر میں تخیل فطرت پر قبول کا احساس ان کی ممکنات
تخیل کا تصور ہے۔ ان کے تخیل یہ ایک برادرست تمدنی اور تمدنی قوت ہے۔ اس اعتبار سے
فطرت کے من مانی تخیل نہ صرف احوال کا ایک جز ہے بلکہ فطرت و تخیل کی یہ تشریح و تفسیر
ہے۔ اس میں دور جدید میں اقبال کی فکر سلامتی کے یہ پہلو یعنی شرف انسانیت و حریت آدمی
انسانی و اسلامی زندگی میں تغیر و حرکت و تخیل فطرت و تخیل کی متاثر رکھتے ہیں۔



عصری ہندوستان میں اقبال کی معنویت

(عالمی سمینار منعقدہ ۱۹۸۶ء میں پڑھا گیا)

عصری ہندوستان میں اقبال کی معنویت کے موضوع پر میں نے چند باتیں مسلم مسائل کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ تاریخ میں بحث کے بغیر یہاں تک اور مسائل ہو سکتے ہیں لیکن اب یہ دوروں میں موقی اور وقت ہے کہ ہم غیر جذباتی اور غیر جانبدارانہ انداز کے ساتھ یہ مسائل کو کھینچ کر دیکھ سکیں۔ یہ بحثیں اقبال کی مختلف باتوں میں ہیں۔ اب ان کی روشنی میں روایت اور تفسیر کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ اب آئیے اقبال کی افغانی سے شروع کریں۔ وہ اس دور میں پیدا ہوئے۔ ان کے انداز میں قندار کا لہجہ ایسا ہے۔ اب انداز میں اقبال کی روایت سے لیتے اس کی قومی توحید اور حب وطن جیسے چیزوں پر روشنی ڈالیں گے۔ اب اس کی پس منظر سے احساس ہو گا ہے کہ ان کی فکر اور ان کی بات اور ان کی عبارت کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہیں۔ اس زمانہ سے ان کے انداز میں لیکن بات اور ان کی عبارتیں اور ان باتوں پر شیٹ ملتی اور محرومی اعتبار سے غور کریں یا ہے۔ یہ کوششیں ان کی عبارتیں پر مشتمل رہی ہیں۔

اس کی ایک نسل ان کے زمانہ کے بنیادوں کے بعد نکلیں جو ہیں۔ شعور کی پائنتی مانی جاتی ہے۔ ان کے سامنے ہندوستانی مسلم سیاست میں اقبال کے دور کے بارے میں یہ باتیں پیش کی جاتی ہیں وہ انہیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ یہ اقبال کے مسلمانوں کے ایک حصہ کے لیے یہ سچہ سچہ بات کر کے ان کے بارے میں صرف مسائل اور مشغلات نہیں پیدا کرے۔ اقبال کی تفسیر کے لیے یہاں ایک پہاڑی راہ ہے جو ہے۔ اس کے بعد ہندوستانی سیاست میں ان کے اثرات کے اظہار کے لیے اس کے چچ و بھائی نامہ اور ان کی سرحد تک اقبال پر عام دہائی ہے۔ یہ سوال ان کی فکر ہے۔ یہ رقبہ حسن اور حق مہسن کے نام سے سب کو ان کا یہ امت کی وجہ سے ان کے لیے ہے۔

استحکام کے ذریعہ اپنا تاریخی ردِ دل انجام دیتا ہے۔

جہاں تک مت کے جز ہونے کی حیثیت سے ہندوستانی مسلم وحدت کا سوال ہے۔ شاید اسلام میں یہ مسلم ہندو کی اعتبار سے غیر اہم ہو۔ لیکن وہ جدید ہیں، ہر مسلم میں مت کے متبادل میں وہ جدید میں اسلام کی تعبیر اور ترجمانی کے سلسلہ میں جو نفاذ ویت ہندوستانی مسلم وحدت و مسائل ہے وہ اپنی اعتبارات سے بڑی اہم ہے۔ مسلم میں مختلف سیاسی حالات، مختلف سیاسی اوروں کی مذاہن بنیاد پر تعبیر اور تاویل اور اس کے اثرات جیسے مسائل یہاں نہیں ہیں۔ ایک اور صورت یہ ہے کہ ان میں ہندوستان میں جہاں مذہب کی بات آتی ہے وہاں اس کے تاریخی پس منظر اور اس کے تناظر کی طرف رجحان زیادہ ہوتا ہے لیکن جہاں تک اسلام کی تعبیر کی اور نکتہ الیہ فیہ روئے کے اشراف سے اہلانات کا سوال ہے تاہم مسلم ہندو بہت خدمت برکتا ہے۔

اس اعتبار سے اپنی فطرتی تشکیلات میں جدید کے سلسلہ میں اقبال کی "نوریت" اہم ہے کہ شامی وادی کے بعد اقبال وہ مفکر ہیں جنہوں نے مختلف اقطاب (Polarities) کے درمیان تعلیق کی راہ انسانی یہ تعلیق جامعیت پسندی ہمیں نصیحت میں نظر آتی ہے جہاں وہ مختلف دینی نظریات کا تجربہ کرتے ہوئے اسلامی حکومت کا جامع تصور پیش کرتے ہیں۔ عقل و وجدان، انسانی و فطرتی، ثابت و تغیر، تخلیق و تخریب، تشدید و اجتہاد، حیر و شہ و جب و قدر و روحانیت و مادیات جیسے اقطاب کے درمیان جو امتزاج اور توازن ہے اس پر بہت مرقعہ دانی کی ہے۔ شاید یہاں اتنا ہی شہ و دانی ہوگا۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ علمائے کرام نے نصیحت میں اٹھائے ہوئے نکات پر بہت مروجہ دیکھی۔ مہازم میں معیاری کوئی تشدید ہی ہوتی تو نصیحت بات ہوتی۔ خطبات اقبال کا ایک مقصد میں سائنس اور تجربہ دانی اور میں حسبِ قوتانی ثابت ہے۔ اس کے زمانہ کا جو دانی فتنہ قہر و معرب اس سے نہیں آئے تھے۔ میں سلف فکر اسی اقبال تک نہیں پہنچ سکتی۔

ان مسائل کی نوعیت صرف نظریاتی نہیں بلکہ خطباتی بھی ہے اس جانب میں ہماری اقدار و ت کے سے بحث و اشعارات بھی اقبال کے ہاں مل جاتے ہیں۔ یہاں میں صرف ایک مثال دینے پرکتنا کر رہا ہوں۔ ملی ٹریڈ مسلم یونیورسٹی میں اسلامیات کے شعبہ کے سلسلہ میں انیس کے میں

قرآن نے یہ زندگی بھر متغیر ہے، جس قسم کا علم زمانہ متوسلے سے مسلمانوں کی سب سے
 قوت سے سینے کی ترقی دیتی ہے۔ ہتھیاری ہوا میں وہ حمل کرنا تو فخر دینی کی طرف
 قیہ نہ ہو، بلکہ یہ نہیں ہے۔ قدرت کا احساس تھا کہ انہوں نے مناسبت سے یہ علم دیا
 ہے۔ ہائیں دوست کی روحانی شوق و سرگشتی۔ اس ضمن میں ان کی یہ توجہ یہ تھی کہ
 "یہ بند اور" کے وہ علم و ہونے میں نہ ٹھیک تعلیمات کا تصور ہی افاقہ رکھتے ہوں ان میں
 کیا نکتہ تھی کہ قیام کے بعد یہ علم کی تعلیم دینی ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ
 بعد و توحید میں علم کے دیوار کے بنیادی طور پر اقبال نے متاثر ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی
 سرکاری ہوا، قیام کے علم میں توحید کی نکتہ میں کہا ہے کہ "یہ علم دیا"۔
 Socio politica انہوں نے صرف ہاتھ میں ان کی بڑھتی تھی۔ انہوں نے
 میں سے "تاریخ کا" ہاتھ کتاب یہ قدرت میں ایسی جتنی منہاں ہے کہ اس کو ازل کا
 "سائنس" کے اس سے روایتی ادبیات نہیں کہیں کہ اس سے نجات ہے اور انہیں کی ہر
 مسلم مفکر کے مقابلہ میں با معنی ہوتی ہیں۔

مسائل سے دور سے یہ کہ ایک بڑا بے چینی میں وسیع تر ہندوستان کے یہ مسائل
 غور رہا ہے۔ اس کی توجہ اور منہ و توجہ تین دست اور ان سے مایہی تہ نسوں کے مسائل سے
 نہیں ہیں۔ ان سے بہتر ہوا اور چاہا ہے۔ نہیں ان کی نوعیت بدل گئی ہے ان پہلوؤں
 کے مابین ان کے ازل و تعلق بننا بڑا شمار کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس میں
 شریعتیں کہیں کہیں کی سادہیت اور آفاقیت میں تنہا نظر آتا ہے۔ ان وہ پہلوؤں و بعد
 جاتا ہے۔ اقبال نے متناہی و مقامات پر اپنے اس سلسلہ کو واضح کیا ہے کہ "اسرار" کے
 متعدد قوم پرستی کا منہ، مڑائی اور ان کی موجودہ ذہنیوں کو بدستور ایک واحد ذہنی فکر
 آراہیا جائے تو اس کے اعداد سے کوئی اور اجتماعی نظم ذہن میں نہیں آسکتا کیوں کہ قرآن کی رہ
 سے سادہ سادگی کی نہایت ہی عادی نہیں ہے۔ اس شریعت کی اجتماعی زندگی میں ایک
 تدریجی طور پر ان کے سب سے پہلے جو اس کے قومی و نسلی ہوتے ہیں ان کو یکسر بدستور میں
 ان اس انسانی خیمہ کی تخلیق، اس سے کہے کہ ان کی روحانی تعبیر، انسانی فکر کی آزادی اور

۱۱۔ بیرونی سوس جو اقوام کے حلقے اور رویے پر مبنی رہتا ہے اسے سب سے پہلے کامیابی سے سنبھالنا پڑتا ہے۔ اس میں یہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس قدرتی اور انسانی قوتوں کے عمل میں مسکنوں کی حیثیت تبدیل کرنے والی یعنی Agent of change کی ہے۔ اس طرح اسود ممالک اور ان کی طاقتیں، مسکنوں کے اصولوں و مقاصد کے بارے میں اقبال کا خیال تھا کہ وہ انسانی تہذیب و ملت پر بہت بڑا اثر ہے۔ یہاں پر بھی سوس کی قدرتی کتاب کا عمل جاری ہے یا رک گیا ہے اور اس کا کیا ہے تو اس کے تاریخی اسباب کیا ہیں؟

جواب: ان کی تحلیل کی سمت تبدیل کرنے والی قوتیں ماضی کی حیثیت سے ہندوستانی مسکنوں کے ساتھ ساتھ ان کی رہنمائی سے ایمین بن سکتے ہیں جو اس ملک کی تقدیر کے صورت میں رہیں۔ ماضی، ماضی کی تعلیمات، کتاب اور سوس، ان کے آئینے میں غور و تحقیق کی ضرورت ہے۔ قدرتی قدروں کی پاسبانی، سوس مسکن وحدت کا بنیادی منصب ہے جو اس کی قدرتی قدرتی طاقتوں کے ساتھ ہے۔ ان عسری ہندوستان میں مختلف لسانی اور جذباتی وحدتوں کا اختلاف چارہمیت میں بدلتا جا رہا ہے۔ اس اعتبار سے مسکنوں کی تہذیبیں اور انسانی سوس پر ایک رابطہ کی حیثیت سے ان کو ملک کی سالمیت و برتری رکھنے میں اہم خدمت ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۲۔ یہ اندازہ ان کا ایک امید ہے کہ رویوں اور جذباتی اصولوں کے اثرات اب کا عمل نہ صرف راسخ رہے بلکہ مختلف وحدتوں کے درمیان فیصلہ و تسبیح ہوئی جا رہی ہے۔ اس میں مسکنوں میں اقبال کے ہندوئی اور تہذیبی شعور کی معنویت کا شعور برقی ہو تو ان مقامات پر غور کرنا ضروری ہے۔ جہاں روایات، آداب میں مدد مل سکتی ہیں اور جہاں ان کے مقامات ماحول ہیں۔ ان میں جہاں جاوید نامہ سے صرف ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا جس کا آغاز وہاں بات سے ہوتا ہے۔ جہاں قبل "سیرت میں بودائی کن مرا" کی دعا کرتے ہیں۔ ابتدا وہی میں لب قہر پر عارف ہندی (وٹھامتہ) سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہاں روی اور عارف ہندی کے مکالمات توجہ کے ساتھ ہیں۔ اس مکالمہ سے بارے میں اپنے ایک کچر میں پرویسر عام خود میری نے بڑی معنی خیز بات کی ہے کہ یہاں اقبال نے ایک بالکل نئے Motive کا اضافہ کیا جس کو آج کل کی زبان میں Dialogue کہا جاتا ہے۔ اقبال نے اس بات کو پوری طرح محسوس کیا کہ نئے انسان کا مستقبل

مقام پر پختہ ہے۔ یہ عالم کہ جس فن کے زمین ہو گا جو اس سے باطنی طور پر متعلق ہے اس کی طرف سے اس کو ہرگز نہیں دیکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کام مہتمم ہندوؤں کا کام ہے۔ اس شخص میں مہتمم ہندوؤں کے اقبال کا تذکرہ ہوتا ہے، اس کی انجمنی بات بھی تھی کہ انہوں نے اپنے ہندوؤں کی اس سے اپنی تہذیب کی حیثیت کو بڑھا دیا اور اپنی ذات قلمب سے افسردگی اور جھوٹ کو دور کر کے تازہ اور نئی پیدا کر دی۔ اور اسے اپنے ہندوؤں کی تہذیب کا بنیاد بنی۔ انہوں نے جس جہاں کے متحارب ہیں اور ساتھ ساتھ ہندوؤں کے اقبال و تہذیب میں راہ بنا رکھی ہے۔“

بانی مہتمم ہندوؤں کا یہ عمل تھا کہ اس کی مدد سے ہندوؤں میں مسیحیت کی روحانی تہذیب کے اثرات کو دور کر دیا اور تہذیب کی روحانی تہذیب کے اثرات کو دور کر دیا۔ اور اس کے انداز میں یہ بات یوں کی پیش کی کہ حتیٰ تک کہ ہندوستان میں اقبال کے فلسفہ ایک ایسا مسیح مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے مسیح شناخت کا قیاس کیا جاسکے۔ اس میں ہندوؤں کا یہ مسیح مذہبی نہیں ہے۔ یہاں فکر قبول کے وہ مقامات ہمارے ہیں باقی ہی جاتے ہیں جہاں فکر اور حاجت سے برکتا دین میں محبت اور نرمی کے ساتھ خود ارمیت اور تہذیب کا یہاں فلسفہ آتا ہے۔ اس سے اس اچالی کی تہذیب اور ملی روایات کے استحکام پر بھی زور دیتے ہیں۔ اور یہ مسیح مذہب میں اس کے اس میں جو اس شناخت میں رہنے والا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اس قسم کے معاملات میں جو اس کے اس میں رہنے والے ہیں وہ رواداری کے استعمال میں غیر محتاط ہیں۔ یہ رواداری ضروری ہوتی ہے جس کی ضروری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو بروا شت کر لیتا ہے یہ رواداری یہ شخص کی ہوتی ہے جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی روحانیت کی حیثیت سے ہوتے ہوئے اور اس کے مذاہب کو برا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔“

شاید اس کے ارمیان و تقویت کو اپنے معنوی اور مادی وجود کی برقراری کے لیے جس Tons on پر تھیں اسے وہ پورا دانا پاتا ہے وہ ایک فطری امر ہے اسی کے اقبال اخلاقی اعتبار سے اس لذت پر پورے رو کی قرار دیتے ہیں۔ ہندوستان میں اس تہذیبی وحدت کے لیے

اقبال کا یہ پیام بھی بڑی مصویت رکھتا ہے 'اگر خود ہی حیات اندر رخنہ لڑی'

مصر کی ہندوستان میں مسلم مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم کی بحث بھی آجاتی ہے۔ وہ جو وہی بات میں یہ زنجیلات مائج ہیں اس حد تک فروغ پاتے ہیں۔ یہ تادم بحث ہے لیکن ملک کے Commitments روشن و رقیبت پہاؤ ہیں۔ بدقسمتی سے اقبالیہ جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم کا معنی ملک بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ کسی ملک کے کشمیر، کھاتہ قری و رعایتی تمام مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان احساسات کی تعمیل میں ایک سے زیادہ شخصیات ہیں۔ اقبال نے جمہوریت کے سیاسی تصور پر نہ تو شدید تنقید کی جو جمہور کی بات میں تھائی اور نہ ہیٹ یا اور اوروں کی لیکن جمہوریت کی بنیاد فلاحی رہے گا آخر موثر رہی اور یہی بات لاری معترفی اور سیاسی اپنی ملی تشکیلات میں ایک فیصلہ کن منہ کی حیثیت ہو تو اس کا سبب دار اقبال سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے اسی طرح سرمایہ اور محنت کی کشاکش میں اقبال کا موقف اور معافی استحصال اور ظلم کے خلاف ان کے افکار واضح ہیں۔

غرض کی ایسے مسائل جو اقبال کی زندگی میں ابھر کر آئے تھے آج پس منظر میں چلے گئے لیکن انسانی تندر اور ایک نئے نئے معاشرتی کی تشکیلات کے لیے اقبال کے پاس جو ترپاتی ہے وہ ساری تہذیب انسانی کا اثبات ہے۔ اس مسئلے نظر سے مصر کی ہندوستان میں اقبال کی انسانیت کا جائزہ لیا جانا چاہئے۔ اور ہر ملے ہوئے حالات میں ملے ہوئے نئی جمعیات متعین کرنی ہوں گی۔ جناب مبین مدین سعدی نے اپنے ایک مضمون میں اقبال کی مشہور نظم 'شعاع امید' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ 'یہ تمثیلی ہندوستانی مسلمانوں پر سادق تسلطی ہے اور اس شعاع امید کی معاونیت اور تشکیلات کے امکانات کے معنی یہ ہیں جو اپنے ہندو مت کے سبب فحش کی ہوئے خاک ہند کے ہر ذرہ کو جہاں تاب بنانے کا عزم رکھتی ہے۔'

شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مصر کی ہندوستان میں اقبال ہمارے لئے نہایت نہیں بلکہ ایک ضرورت ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اس منزل کو جہاں دوسروں کا فلاحی ہر قدم ملتا ہے اسے نہ ہر آغاز بنانا ہوگا۔

ابتداء میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ہماری عصری درس گاہوں کے انصاب میں مذہبی و اخلاقی تعلیم کا پہلو شامل نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مقامی انتظامیہ اس سلسلہ میں ضروری اقدامات نے یہ آزادی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں کشمیری ذات میں کسی گروہ کی مذہبی اور تہذیبی شناخت کا مسئلہ اصرار کرتا ہوں لیکن یہ واضح رہے کہ ایسا ولی تحفظ Isolation پر عمل پیرا ہے۔ اس سے کٹ کر نہ ممکن ہے نہ ممکن۔ اگر ملک کے کسی گروہ کے لیے ایسے اقدامات جو نو جوانوں کی شخصیت و بردار کو سنبھالنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں تو ہمارے مذہب و ملت پر عمل پیرا ہے اور یہی شر و گمراہیوں کا اقبال نے اپنے مذہب و پابلیکیشنوں "بچوں کی تعلیم و تربیت" میں اس جانب اشارہ کیا ہے۔ اقبال نے یہ بھی کہا کہ خدا انسان کی طرف سے جو دنیا میں زندگی دیتا ہے اس سے پہلے انسان کی تخلیق سے قبل جو انسان ہوتا ہے اس کی زندگی میں جو وہ اس مبارک تعلق سے غافل ہوتا ہے جو بہ حیثیت انسان ہونے کے ان کو باقی افریقہ کی طرح (یعنی انسانیت) سے جو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلم طلباء و طالبات کی شخصیت سازی اور روحانی تشکیل و ترقی ایک ہی مسئلہ نہیں ہے۔ پوری انسانیت کی فطرت کا پہلو بھی اس میں شامل ہے۔

اب آئے بڑھنے سے پہلے شاید مناسب ہوگا کہ ہم شخصیت کی فطرتی آسان اور قابل فہم تعریف متعین کر لیں۔

ہم انسانی شخصیت کی ہر ایک اور روحانی اعتبار سے منفرد ہوتی ہے یعنی وہ دوسرے سے جدا و ممتاز ہوتی ہے۔ دوسرے معنی میں شخصیت انفرادیت کا نام ہے۔ شخصیت سازی کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کی اہمیت اور مقام کو سمجھے، اپنی ذات و اس کی عظمت کو پہچانے کہ خالق کائنات نے اسے بہترین صلاحیتوں سے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ اس کے اندر بے پناہ استعداد و قابلیت رکھی گئی ہے۔ اب ان صلاحیتوں کی پہچان و ترقی دینا انسان کا اخلاقی و مذہبی فریضہ ہے۔ اگر وہ اپنی شخصیت کی نشوونما نہیں کرتا تو وہ اپنے وجود کے منتہی کی تکمیل نہیں کرتا۔ دنیا کی ہر چیز اپنا انبھار پاتی ہے۔ ایک بچہ کے اندر ایک تاؤ و درخت کا روپ اجماع کے ساتھ پوشیدہ ہوتی ہے۔

ظلمت کدو خاک پہ شاکر نہیں رہتا
ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشوونما کا

[illegible]

آغوشِ صدف جس کے انہیوں میں نہیں ہے

$\frac{1}{2} \times \frac{1}{2} = \frac{1}{4}$, $\frac{1}{2} \times \frac{1}{4} = \frac{1}{8}$, $\frac{1}{4} \times \frac{1}{4} = \frac{1}{16}$

یہاں ساری باتوں کی توجہ اور اس کی سہولتوں کی نشاندہی سے قلم اقباس چاہیے اور اس پر چھوڑ دینا ہے۔ جس طرح مرنے والی اپنی تاب کتاب سے نہ صرف چھوڑتی ہے بلکہ اس کی توجہات کی تربیت میں توجہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جس طرح ایک شخص کی شہادت کے لئے ضروری ہے کہ اسے شہادت میں پایا جائے۔ اس سے ماہر حیاتیات میں یہ طرح کا قانون ہوتا ہے۔ اس کو زندگی بخشنے والے ماحول میں ہی پرورش ہوتی ہے۔ چاہے وقت کے پائے اور کمالات باقی نہیں رہتے۔ یہی طرح فرد کے حالات اس کی استعداد کی ترقی سے ہے۔ یہ ماحول ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقباس کی صلاحیتیں ہی بخودی ہے۔

اقبال کے اثر بتدی جس منہ کی روشنی میں شجیت سہاڑی سے قبوں کے تمہرات ہ ایک نہ کہ
آسانی سے مرتبہ یہ پرتقا ہے یہاں پشند ہم با قوں کا اشارہ دانی ہے۔

۱۔ پہلی فیرونی بات حیرت سے مردوں و عورتوں کی تشبیل سے ہے مستحکم ایمان اور عقیدہ ازلگی ہے۔ انسانی حیرت و خرد کی اور اجتماعی سماجیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے اس حقیقت کو پیش کرنا چاہیے۔ مذاق کا نکتہ ہے کہ کائنات میں اعلیٰ ترین تعلیم دینا کر کے اسے اپنی سنات کے یقین سے سرفراز کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام و سنات کا مختلف مددگار کے لحاظ سے انسان میں شہرہ ہوا ہے۔ بتائیت ساری کے لئے انسان کا فریضہ ہے کہ ان دنیا کی کئی سنات کے رتبہ و اپنی شخصیت اور کردار میں بہ کرے۔ جتنا یہ رتبہ بڑھوگا اتنا ہی اس کی تنہیت مستحکم ہوگی۔ تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں بھی اقبال کا کہنا ہے۔

جو ہر میں ہے ”لالہ“ تو کیا خوف
تعلیم ہو گر فرنگیانہ

اور یہ ماحول، اس کے عقیدہ اور تہذیبی قدروں کے موافق نہیں ہے لیکن اس کے
”خالق“ میں ”لالہ“ رائج ہو تو نہ صرف ماحول پر غالب آسکتا ہے، اس کی منتشر رکی قوتوں سے
مکمل طور پر سکتا ہے۔ اپنی شخصیت کو مستحکم کرتے ہوئے معاشرہ پر تر انداز ہو سکتا ہے۔ عویہ و حید کا اقرار
شرف انسانیت کا اقرار ہے۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید بھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضیہ سے اگر خلعت کردار نہ ہو
خود مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلمان کا مقام

شخصیت کے کئی رشتہ اپنی تخلیقی کے لئے ایک اور اہم بنیاد محبت بلکہ شدت محبت ہے۔ اس کے
کے محبوب دال میں بسا نغمہ دہی ہے۔ اس طرح کہ یہ محبت، محبوب کی ہر ادھر پر عمل اور باتوں کا محور و مرکز
بن جائے۔ یہ محبوب کوئی اور نہیں ہے بلکہ ختمی مرتبت حضرت محمد ﷺ کی ذات برامی ہے جو
”مقامِ مناس“ ہر راہ و ذمے کی محبت میں شخصیت کے امکانات کا محور پوشیدہ ہے۔ تنصیل کا موقع نہیں
ہے اور زمانہ ماضی میں ﷺ کی ذات طیبہ کا مطالعہ اس مسئلہ نہایت کیا جائے کہ آپ نے افلاکی
نما، حیثیتوں کو کس طرح پرکھا، ان کی کس طرح ہمت افزائی فرمائی۔ ان کی سیرت و کردار کی تشکیل فرمائی
کہ ۲۳ سال سے عرصہ میں ساری دنیا کی کاپی پلٹ گئی۔ دنیا میں ایک انتہا سبب مسلسل کی بنیاد رکھ دی گئی تو
ادری و سیرت کے لیے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ یہاں تربیت نہ کی گئی، ذاتی نسیانی کو مل نہ رہا
ہائے امجدہ کرتے ہیں۔ اس معاشرہ میں مختلف کردار نمونے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں مثالی بن
گئے۔ ع ذرہ در یک کو دیا تو نے فروغ آفتاب۔

اقبال کہتے ہیں مسلمان کی سرشت ایک موتی کے مانند ہے جس کی آب و تاب ”یہ خیر“ کی شہنائی
میں ہوتی ہے۔ ہمارے قائدین، سماں کرام، دانشمندان و عظام کے سامنے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے

دشمن اور محبوبین کا مبارک رشاجہ کہ ہر شخص کے ساتھ اس کا شیطان کا ہو ہے۔ یہ شیطان ان خیر کی قوتوں کا مددگار ہے نہ انسان کو اس کے طبی مقام و مرتبہ سے نیچے برا کر پستیوں میں اٹھکھیل دیتا ہے۔ اس کے توحید ساری کے لئے ان انتشاری قوتوں سے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مختلف شیطوں اور رباہوں میں آتی ہیں۔ ہر شخص اس سے آگاہ ہو بہ جنم رہا ضروری ہے۔

بدل کے بھیں پھر آتے ہیں ہر زمانے میں

اگر چہ حیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

توحید کی تعمیر کے لئے سب سے شے نہ صرف توحید و منتشر کرنے کے بلکہ اور ان کی توحید پیدا کرنے کے عوامل سے تعلق ہے۔ یہ ایک یہاں جو تصور ہے جو ہمارے وجود کو بلند یوں کی طرف سے جاتا ہے۔ قبائل کے عبادت کے تمام ارکان کے ہر ایک اس نقطہ نظر سے انشیں انداز میں سمجھنا چاہئے۔

قبائل نے جہاں توحید سازی کی تعمیر کر کے مختلف پہلوؤں و پیش کیا ہے وہیں انہوں نے ان لوگوں کی توحید کی توحید کی ہے جن سے توحید میں انتشار، ضعف اور انحطاط پیدا ہوتا ہے۔ ہر ایک توحید کے لئے ایک سبب ہیں ایک ہو کے نفس کی پیروی اور اس کے مدد ملی۔

انسان جب حاکم انہی کی پابندی و رضا کے لئے اپنی خواہشات اور جذبات کا شمار نہیں کر سکتا نام نہاں جاتا ہے تو توحید میں ہر طرح کی مذمہ مصداق پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارا مشہور ہے کہ وہاں کے اندر خود پسندی، خود بینی، غمی، غمی پر مبنی پیدا کرتی ہے۔ شہرت کی تمنا، عزت و منصب کی طلب، دولت کی خواہش نہ صرف توحید و توحید کو برائی ہیں بلکہ وہاں میں خفاہت، اور غم و غم، غم و غم، غم و غم ہیں۔ ایک بروہا دوسروں کو برداشت کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔

اس طرح قبائل کی نظر میں کدائی ایک ایسی مذمہ مصداقیت ہے جو ذہن اور روح کی آزادی کو سب کو برائی ہے اور اسے ہر طرح کی ذلت پر آگاہ و برائی ہے۔ کدائی صرف حبیب، غم کے کاٹا نہیں ہے بلکہ فکری اور عملی اعتبار سے وہ عمل ہے جو اس کی خودداری، سب نیازی کو ختم کر دیتا ہے۔

دوسروں کی محنت پر تمہارے کرنا بھی مدد کی ہے، رشوت بھی ایک کدائی ہے۔ دوسروں کے لئے

دنیا اس باتوں پر مبنی نہ تھی کہ یہ نہ صرف شہسوار کی خدمت ہو بلکہ اس کی خدمت کی اہمیت ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات

جب جھکا تو غیر آگے نہ تن تیرا نہ من

اقبال نے اپنے کاموں کی اہمیت، تشبیہات کے ذریعہ شہسوار کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی پیدائش و پیشانی پر افسوس کا اقبال نے جو انوں و جوہر میں یہ اسے تمام کی پسندیدہ علامت شاہین کی صفات سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

جہاں سے منہ منہ سے رہتا ہے وہاں سے یہ سب باتیں شہسوار کی رشید و نجیبہ سے اس کی تہذیب و شہسوار سے ہیں۔ ان کا سوال تھا کہ شہسوار کی اہمیت شہسوار کے لیے کیا ہے؟ کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

یہ سب علامتوں کی تعلیمی اہمیت، شہسوار کی تعمیر کے لیے ان کی مراد مندی و تربیت کا ہے۔ شہسوار کی اہمیت یہاں سے نہیں ہوتی ہے بلکہ ترویج ہوتی ہے کہ شہسوار کی اہمیت کے لیے شہسوار کی تعلیمی صورت رکن کے لیے جو جوہر و وسایل کے روشنی میں کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں یا نہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جو بہت زیادہ آرزو مندانه ہو چکا ہے۔

نہیں ہے بندہ خُر کے لئے جہاں میں فراغ

بال جبریل کی ایک نظم

”مبداء الرحمن ال کا بویا ہوا کجپور کا پہلا درخت سرزمین اندلس میں“
تجزیاتی مطالعہ

ایک بڑے منکر کی حیثیت کے اقبال نے ان کے ادبیات کا یہ نام دیا جس میں
مذہب اور مذہبی کے تمام مضمون ہیں۔ یہ ان کی مذہبی عقائد کے بارے
میں اس کا بیان ہے۔ اس کے ساتھ پیش کیا ہے جو بات نہیں ملی اور جہاں ملی نہیں ہے اسے
پہنچا ہے۔ اور اس کی ترست سے پیدا ہوا اور اپنی اس اور شاعرانہ رنگ و آہٹ کے
ایک یہ قیاس کیا۔ اس کی ایک مثال ان کے مجموعہ ”بال جبریل“ میں مشرق و مغرب کے ہند
یہ شعراء کی کہیں اور تصور کے تراجم ہیں۔ کہیں کی فکر کے مانگے میں ان انموں کا لفظ و قول
اس کی تفسیر اس کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اقبال کا ایک شعر پہلا ہے: ”یہ ہے اللہ کے
اسی اللہ و قول کی ایک مثال ہے۔ یہ نظمیں تو اندلس میں ہی انسانی حیثیت کے بانی
مبداء الرحمن (اللہ اول کے تبار کے) کی ایک نظم کا تراجم ہے۔

اسی یہ تراجم ہے کہ اقبال کی ایک نئی ہیئت ہے۔ یہاں اندلس میں مبداء الرحمن
کا بویا ہوا کجپور کا پہلا درخت مذہبی عقائد کے بارے میں اقبال کی اس تاریخی ملاحظہ
تبدیل کے ساتھ ہی اس کے ساتھ ہی ایک نئے معنی اور تصور میں آتے ہیں۔ یہ ایک بڑے تراجم کا
اس کا نام ہے۔ اس کے نزدیک مذہب صرف انجیل و قرآن کا ایک انوکھا پہلو نہیں ہے بلکہ
ہندو مذہب اور مذہبی پس منظر میں خود انسانی تجربہ و تفسیر کے ساتھ نکلتا ہے۔ یہ انسانی ہے
جہاں انسانی عقائد کے پیچھے پرچست نہیں جانتی وہاں ”پرہیز حرف کا تختہ“ اس کو دینی بن جاتا
ہے۔ مذہب اور اس کی معنویت ”الحیف“ حساسات اور حیثیت کی آمینہ اور بن جاتی ہے۔ لیکن
اس کا مزہ ایسا ہے کہ کارائش میں ہے کہ وہ حدیث غلطیوں میں ہے۔ اقبال کی ترقی دینی اور
برقی ہوئی سامتوں کا متاع اس نقطہ نظر سے یہاں تو اس کی فکر کے بہت سے پہلو روشن

میت یہ نام تجہانی اور تاریخی پس منظر سے بلند ہو کر آفاقی و پرہیزگار کا بندھن بنتی ہے اس
 مرتبہ یہ نام نسائی تجربہ و اخیت کا ایسا نہیں رہتا جہاں ایک فوقی اور مادیانیت کا تقابل بن جاتا
 ہے۔

باقیوں میں نظم ویزجہ ہے۔ اس نظم کا عنوان نہ ملاحظہ کیجئے۔ یہی مہدار زمین اوس کا
 دیوانہ کا پند و درست مرز میں اندلس میں، اور اس شکر سے پہلے قبوں کا یہ ٹوٹا ہوا ہے۔
 یہ کسی مہدار زمین والے کی تھک سے جس کا شاخ و برگ میں درن میں۔ مندرجہ ذیل
 نظم ان کا آزاد ترجمہ ہے۔ درخت مدینہ الزہرا میں بویا گیا تھا

میری آنکھوں کا نور ہے تو	میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں	میرے لئے نخل طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا	صحرائے عرب کی حور ہے تو
پردیس میں نا صبور ہوں میں	پردیس میں نا صبور ہے تو
غربت کی ہوا میں بارور ہو	ساقی تیرا خم سحر ہو
عالم کا عجیب ہے نگارہ	دامان نگاہ ہے پارہ پارہ
ہمت کو شادری مبارک	پیدا نہیں بحر کا رور
ہے سوز دروں سے زندگانی	امتنا نہیں خاک سے ترارہ
صبح غربت میں اور چکا	ٹوٹا ہوا شام کا رور
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے	
مومن کا مقام ہر کہیں ہے	

باقیوں کا عنوان کے ترجمے کے تجزیہ۔ پہلے شاید مناسب ہو گا کہ اقبال کی نظمیں
 نور پر جا۔ اقبال نے اپنے استعار اور نظموں کے بارے میں بڑے مختصر اور کتاب پسند لکھنے کی
 نظموں کے عنوانات مختصر ہیں لیکن یہ ایک ایسی واحد نظم ہے جس کا عنوان طویل ہے
 سمجھا ہوا کی ثورۃ کجھو رکا چکا درخت ہے۔ لیکن مہدار زمین اوس اور مرز میں اندلس و اندلس
 کا نسائی تذکرہ بھی قبوں نے عنوان میں ضروری سمجھا ہے۔ یہاں دونوں اقبال کے رویے

نے اپنے آپ کو بلکتے میں ڈال دیا اور ایک دہرا راز جزیرہ میں جا آکا اور وہاں حلقہ بستہ فوجیں اس کے متحمل نہ کیے مگر اس نے اپنی ہمت اور فراخی سے انہیں شکست دی۔ اپنے حملوں سے ان کی سبھی ایک دوسرے پر استدریں اور اپنی حکمت و انائی سے ملک کے بے دلوں کے دل کو ہلکا کر دیا۔ ملک پر اس کی بادشاہی ہوئی۔ وہ شخص اپنے دشمنوں کے قہر ہے اور اپنے عہد کا چاہنے والی سرحد کے پاس کسی کو پہنچنے نہیں دیا۔ لوگ اس سے محبت بھی کرتے ہیں اور ڈرتے بھی ہیں وہ جوان قوی ہمت ہے۔“

(تاریخ اندلس زریاست علی بن عبدالمطلب و دارالمستعین ص ۳۱۴)

منصور نے ایک مرتبہ اپنے رشتہائے محکم سے پوچھا کہ قریش قریش کا بڑا شاہین ہے۔ دینارین میں سے کسی نے خود منصور اور کسی نے عبد الرحمن بن معاویہ کا نام لیا۔ لیکن منصور نے جواب دیا۔

”متر قریش عبد الرحمن بن معاویہ ہے خونخواروں اور تلواروں کی دھماکت پٹی حیدری سے نکلے گا۔ چٹیل میدانوں کو میوڑ کیا۔ مندر پر سوار ہوا، یہاں تک کہ ایک انجلی ملک میں خل ہوا اور شہر اس پر شہر بسا۔ اور فوجوں پر فوجیں ترتیب دیں، راہیں تدبیر کی، ٹوپی و رمز کی پتیلی سے نئی کھائی ہوئی حکومت وہ بارہ قلم کر لی۔ عبد الرحمن اپنی ذات سے یگانہ تھا۔ صرف اس کی راہ اس کی سید اور اس کا عہد اس کا رفیق تھا۔“ (تاریخ اندلس)

منصور نے عبد الرحمن اول کو قریش کا بڑا کس کے کارناموں اور شخصیت کو آج کی مشہور خدمت شاہین کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ قبائل نے اپنے دار و اپہن کے موقع پر اپنی جگہ پر کارنگر بدقت طبع تھی۔ اس میں اس کے فیئین کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

کہ وہ مردن حق و دہرلی شہسوار	د مل خلق عظیم، صاحب صدق و یقین
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب	سلطنت اہل دین اتر ہے تباہی دہش
جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب	خدمت یورپ میں تھی جن کی خور و راء میں

بڑے یمن آج بھی ان کی ہواؤں میں ہے

رنگ حجاز آج بھی ان کی فواہ میں ہے

چرتے تھے سینوں و تنہا رت ہے ساری۔ باقی ہے ابھی رنک مرے خون کچھ میں
 قلم کے تجویز سے پہلے، عہدِ ارمن میں اور سرزمین کا یہ تذکرہ جس سے کیا گیا کہ میں ہیں
 مثنوی میں اس ظہنی و معنویت اب رہا سکتی ہے۔ در یہاں اس بات کا اظہار بھی مقصود تھا کہ اقبال و
 ندس کی تاریخ و ادب و آثار کے قلمی و لکھی قلمی۔ چنانچہ ایک اقبال شناس ڈاکٹر پورٹ نے جنہوں
 نے ندس کی تاریخ و ادب کا نسوہی مطالعہ کیا ہے اس نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے۔

”اندس کی تاریخ و ادب کے معنی مطالعہ کا تھا۔ یہاں چاہے تو اقبال کی فکر کے فی پہلو
 روشن ہو جاتے ہیں۔“ (مجلہ اقبال ماہورا کتور ۱۹۶۸ء)

اب آئیے سرزمین اندس میں عہدِ ارمن میں کے بوسے بوسے کھجور کے پتے درخت کی
 طرف مبدائیں نہ صرف ندس کی عقیدہ اشان سسٹم کا بنی تھا بلکہ یہ مغرب میں ایک نئی
 تہذیب کی بنیاد رکھنے والا بھی تھا۔ اس نے قریب سے قریب ایک تہذیب کا وہ بنی و اس کا نام
 اپنے والد شام کی یہ کاہ پر صافہ رکھا۔ یہ بڑا سخی اور پرفسہ باغ تھا۔ عہدِ ارمن نے اس کو بڑے
 شہاب و شائق سے آراستہ کیا اور راز خصوصاً دمشق و بغداد سے خوش نام و رشتوں اور لذت بخشوں
 کے پورے اور بچے منکوار کر کے۔ عہدِ ارمن کی بہن ماسچی میں سیسے شام سے میوؤں کے تھکے
 کے ساتھ پورے اور بچے بھی رو نہ کرتی۔ اس کا جیب ہو کھجور کا ایک پودا صافہ میں لگا پائیہ اور اس
 نے اس نئی سرزمین میں اپنی جڑیں منبوط کر لیں۔

عہدِ ارمن کو درخت سے بڑا نفس تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ سے باغ میں بیٹھا مسلسل
 دیکھتا تھا۔ وطن سے دوری کی کیفیت میں کھجور کا یہ درخت گویا اس کا رفیق تھا۔ ہم ساز
 اور زماں بن گیا۔ عہدِ ارمن صاحب علم و فن تھا۔ ادب و شعر کا اچھا مذاق رکھتا تھا اور خود بھی شاعر
 تھا۔ کھجور کے درخت کے ساتھ اس کا تعلق قلمی مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ عہدِ ارمن نے کھجور
 کے درخت کو مخاطب کر کے اور بھی اشعار کہے ہیں۔

”اے نخل! تو مغرب میں میری بی طرح غریب وطن اور اہل سے دور ہے۔ تو بھی
 رہ کر جو کوئی ہو جو منہ نہ دے ہوئے ہو اور جس کی جہت میں آواز نہ ہو، وہ بھی بھلا کبھی روئی
 ہے۔“ (روانا آتا تو وہ نہرو روئی، فداست کے پانی اور نخل کی سرزمین کیلئے۔)

سین و بکس ہے اور اپنے اہل خاندان کی بابت شش بکس ہو گیا ہوں یہ سب اس بکس کے جو مجھے دعوہوں سے ہے۔ (مکتب ملاقات مجلہ قہال، نور مرتبہ، ہر شاہی کس ۶۳، مشہور ہندوستان اور نکل مشہور نکلارڈ سید محمد یوسف)

سید محمد یوسف نے ان اقدار پر تہہ و تربتے ہوئے لکھا ہے۔

یہ تعارضی ادب میں ایک نئے مہار کی نشاندہی کرتے ہیں جس طرح عہدِ ارمین بد نکل سے یپانی حکومت اور مسرت کی بیواؤں کی۔ اسی طرح ادب میں بھی نئے مہار کی اور سب کی بد نکل ایسا مذاق بد تھا وہی یہ نام نہی مہار کے ساتھ تھا۔ جو دوسروں کو خوش و غصہ کیسے قسیدہ و مدح سے بے نیاز ہو جو اپنے داخلی جذبات کے دہاوے بکجور ہو کر تھیں (یعنی نکل ہندوستان کے اہل مذاق) اور تھیں ہی اس لیے بے اختیار شعر نے اور جو سب سے بد نکل ادب میں بھی طرز کہن کو بد لئے نہ جھجک۔

تہا ب معطلوینہ یعنی فطرت سے اترنا اور فطرت و آثار و فطرت کے بندہ و فطرت اس بوئی روئے اور دنیوی شش کی شگ پر ناچکر سے تریب اور زرداں بنا کر پئے آس و فطرت نے نجات دینا اس کی بداد اندلس میں عہدِ ارمین کے فطرت سے بوئی اور تھیں آس و فطرت کے بد نکل و مہار کی شش مہار کی فطرت ہندی۔ مہار کی یاد تھیں (Nostalgia) بکجوری و تہا بانی اس کے روئے مہار میں اور ان کی تربیت سے مہار کی فطرت کی مہار کا روئے مہار کی تربیت کے اندلس میں تھی۔ (حوالہ بالا)

ایہیں سے مسلم مہاروں کا کجور کے درخت سے مہار ان کے فطرت میں بد نکل ہے۔ چنانچہ مہار فطرت سے ستون و مہاروں سے مہار ان کے بد نکل مہاروں مہار فطرت سے مہار و مہاروں میں مہار کے ایک مہار کا مہار پیش کرتے ہیں جس کی جانب اقبال نے اپنی فطرت مہار فطرت میں تھی مہار کیا ہے۔

تیری بنا پادار، تیرے ستون بے شمار، تمام کے مہار میں مہار تھیں مہار مہار عہدِ ارمین کے ان مہار کے مہار سے جن کا تہہ و مہار ان کے پادار کی پادار مہار پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ مہار اس مہار کی مہار اپنے مہار میں مہار ہے اور ایک مہار مہار

یہ نئی دیریت گمان آتا ہے۔ غربت کی قوم میں قوم کی مصورت و تہذیب رہا کرتی ہے۔ اس
شے میں اس سے دوری اور تنہائی کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔ مگر غرض اشعار میں وہ یہ
وہ مہمان کی شگفتہ و شدید احساسات سے ملتی ہے۔ یہ احساس اور مہمان ہے۔

اس مہمان سے ملنے آتا ہے۔ اہل نئی نئی اور یہ نئی مہمان میں وہ نئی قوت
انہماک و مہمان دیریت آتی ہے اور مہمانوں میں تہش کا احساس نہ آتا ہے۔ یہ دیریت کی قوم
یہ دیریت کی قوم سے فطرت و مہمان کی قوت مہمان کی قوموں کا وہ مہمان
اپنی حیات کا ثبوت دیتی ہے۔

اقبال کے اپنے پانچویں قصیدہ "مکی تہذیب کی رون" میں ان مسئلوں کے واسطے
دیریت کی قوم اور دیریت سے ہوئے مہمان کے درمیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ دیریت کی قوم سے ہوتی
نہدی کے مہمان کے مہمان پر ہے جس کے دیریت کی قوم کی مہمان کی قوم ہے۔
Date Pam میں جنس کے فرق کی بھی بحث نہ آتی ہے اور اس کی جز اور ریشہ کے مہمان
ایک ہی دیریت مہمان کے جو مہمانات میں دیریت کے مہمان ہے اور اس کے استحکام میں مہمان
کی زندگی کا انحصار ہے۔ (خطبات ص ۱۳۴)

مہمان کی قوم کی قوم کا مہمان کے زیادہ مہمان شہر ہے اور جو مہمان کی قوم
نہایت تر مہمانوں کے مہمان کی قوم میں یہ پورا مہمان اور مہمان کی قوم ہے۔ اس کی قوم ہے۔
اس دیریت کی قوم اور مہمان کی قوم کے اس مہمان سے ہو جو مہمان اور مہمان کی قوم ہے اور جو
مہمان کی قوم کے مہمان کی قوم کے مہمان کی قوم ہے۔

مہمان کی قوم کی قوم کے مہمان کے مہمان کی قوم کے مہمان کی قوم کے مہمان کی قوم کے
آئیے جس سے قبل کے مہمان کی قوم کے مہمان کی قوم کے مہمان کی قوم کے مہمان کی قوم کے
پہلوں میں وہ مہمان کی قوم کی قوم کے مہمان کی قوم کے مہمان کی قوم کے مہمان کی قوم کے
تہذیبات و راستی رات سے بنے ہیں اور مہمان کی قوم کے مہمان کی قوم کے مہمان کی قوم کے
اقبال کے "آنکھوں کا نور" دل کا نور "نمل سور اور" "حسرت کی قوم" کے مہمان کے
پر تے ہیں۔ ان ستاروں پر نور کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مہمان کی قوم کی قوم کے

”حمرائے عرب کی حور“ کی تشبیہ سے علامت کو ایک نئی جہت عطا کرتی ہے جس کا راز زمین عرب سے تہذیبی سرچشموں سے ہے، ایک عرب اپنے گنجورہا درخت کی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ریستاب میں نہ صرف روزنی اور چمکتی ہوئی محبوب میں یہ سایہ دار یہ ہے بدست و انسا رہا اور چمکتی ہے۔ حمرائیت اور بدایت کی تفسیر اقبال نے ہوں کی حد تک ہے۔ اقبال نے ایک حمریت عربوں کی جنماتی مادی و رانی کی ابتدائی فہم کی حالت کا آمینہ ہے۔ اقبال نے یہاں گجورہ درخت کو حمر سے عرب کی حور بدست سادلی اور فطرت پسندی کے ساتھ مہر و باقی کی عزت عطا کی ہے۔ حمر .. ناقہ، ٹیل یہ سارے ماحول کی انبہار اور اس کی معنی ہے عربی تخیل کی دین ہیں۔

یہاں اس استعارے سے ماتمہ ہوا، زمین اقبال کی ایک دانش ور تہذیبوں کی مادی (نقد سارہ بن ہزار) کی مدنی منتقل ہو جاتا ہے۔ جہاں اقبال نے ناقہ کو بھی حور سے تشبیہ دی ہے۔ ایک بدوی نے حمر میں اٹ، نہ صرف اس کا مادی سہارا ہوتا ہے بلکہ اس کا محبوب اور رفیق بھی بن جاتا ہے۔

(۱) دانش اور بیانی شاہد رمناسی (۲) ردائیں حوراسی غیبت لیداسی (۳) ذرۃ صغراسی

تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

یہ دیکھ میں انسان کی ماصوری، آرزو کی وہ خلش ہے جو ہر سن مضطرب رکھتی ہے۔ یہ مادی مہم اور زنجیر ہے کہ انسان موجود پر قانع نہیں رہتا بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش سے بے چین بنتی ہے۔ انسان کی معیشت اور حرکت کا راز اس میں ہے کہ وہ کس طرح ماحول پر قابو پاتا ہے۔ اس تسنیر میں اس کا بنیادی جذبہ عشق ہے۔ جس کی ایک کیفیت ماصوری ہے۔

مبداء زمین نے اپنی نظم کے آخر میں یہ تمنا کی تھی کہ اس درخت کی سیرابی صبح کے ان بادلوں سے ہو جو مکین سے پانی لے کر بارش برساتے ہیں۔ اور یہاں اقبال اس نظم کے پہلے بند کے آخری شعر میں ”کرتے ہیں“ اس قافیہ ترنم سحر ہوا یہاں سحر اور اس کی ٹہنی دونوں بڑے بلیغ اور پرمعنی ہیں۔ حمر اقبال کے ہاں بیداری اور ایک نئے انقلاب کی علامت ہے اور یہی وقت ہے جب کہ سلسلہ راز و شب میں کتاب ہستی کا ایک نیا ورق الناجا ہوتا ہے۔ صبح کا وقت یوں بھی عشق کی

نیا رندیوں کیسے ٹھنوس ہے۔ ان قرآن العجریں کا مشہودا (قرآن مجید) کا ارشاد شادی، شہنشاہی اور روحانی بایدگی کیلئے صبح کی اثر فریغ کا شہد ہے۔ (قبر کے ہاں صبح کی رفعت اور بندگی کا سب سے دلکش اظہار وہاں ملتا ہے جہاں وہ ذات رسالت تابعدار کے وجود مبارک و صلوٰۃ صبح کی پرکھ و پرسوز کیفیت سے یاد کرتے ہیں۔

اور جہاں ذکر و فکر انس و جان تو صلوٰۃ صبح تا ہفت اذان یہ تو تھی سحر اور صبح کی بات اب یہ "نم" "نیم" ہے۔ یہ شبنم شبنم ہے جو صبح دم غنچوں کی آنکھوں سے خواب کے اثر کو، تھوٹی ہے اور اسے بیدار کرتی ہے۔ شبنم کی نمی کی بات آہ سحر اور اشک سحر شب پہنچتی ہے۔ یہاں پیام مشرق کی دلکش نظم کا ایک شعر پیش ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رب ایام کی نمی دراصل اشک سحر کی مرہون منت ہے۔

نم در رگ ایام ز اشک سحر است (پیام مشرق۔ شبنم)

فصل بہار کا یہ بند بھی پڑھ لیجئے۔

دیدہ معنی کشا اے زعمیاں بے خبر

اے کمر و کمر

میرہ آتش بہر

می چکدش بر جگر

شبنم اشک سحر

در شفق انجم نگر

دیدہ معنی کشا اے زعمیاں بے خبر

اس طرح اقبال کی یہ آرزو بڑی معنی خیز ہے کہ غربت میں نمود پانے والے اس نخل کی

بالیدگی نم سحر ہوتی ہے۔ بات نخل تک ہی کیوں محدود ہے۔ فرشتوں نے آدم و ہنت سے رشتہ کرتے ہوئے ایک راز کی بات اس سے کہ دی تھی۔

منا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن تری سرشت میں ہے کوہی و مہتابی

مگر اں پہا ہے ترا گریہ سحر گاہی اسی سے ہے ترے نخل کہن کی شادابی

اقبال کا مشاہدہ بھی یہ بتاتا ہے کہ

معارف و راہی و رازی ہو، غازی و چھ باتیں نہیں آتا سب آکر رہتی
اب نہ جاوے اور ابتدا شروع کرتا ہے، یہ نیا مشہور طبع کہتا ہے سب میں انداز
نہروں سے اور تجلیں و باقی ہے اور راجہ منٹو سے کہتا ہے آجاتا ہے۔ بعد رقص کی حد مرادوں
سے لیتا ہے۔ نفس کی حالت کی حد سلسلہ کی حد یہ کفایت جیتی ہے۔ اس طرح اس حد کی
حریت یہ۔ کافی تھی اور غراویں مدت و دراز ہو۔ ہر سہ پہر پڑھتا ہے اور جاتی ہے۔

عالم کا عجیب ہے نظارہ

دامان نکاو ہے پارہ پارو

اس سے بلند دیکھا مثلاً ایک امر ایک وسیع دائرہ میں کے آتا ہے۔ اس سے اس سے
ساتھ ہی ساری تاریخ انسانیت، تو جو وصل کا عروج و زوال، مختلف تہذیبوں کی تہذیبات،
چراغ کی چستی نہیں، یہ سارے حوا سے واقعات نگاروں و روحانیوں کی قلم میں سامنے آتے ہیں
اور ان کا جائزہ اس قلم پر چاہتا ہے کہ انسان اور اس کی تاریخ کا وہاں عزم و ہمت کے ذوق
قلم کا نہیں ہے اور اس سنیہ و کا وہاں میں انسان کے مقصد اور اس کے امکانات محدود ہیں
۔۔۔ اپنے ذائقہ و متعدد کے بھڑکوں سے اپنے مستقبل کا نہ کر رہا ہے اور وہ اس کیفیت کو جان
پہتا ہے کہ اس کا قلم محض تاریخی قوتوں کا یہ نہیں بلکہ اس کی تشیل میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔

انہی باتوں سے ٹھک سحر و نسیم صبح کا ہی تک پہنچی تھی۔ اب تیرے شعر میں قہر
"نہاں" اور شرارہ" کے دو لفظا کہہ کر اس کے ملازمات کے ساتھ منہ سب کی ایک دہائی آہا کرتے
ہیں اور یہ تر رہا ہے

نقطہ نور کے نام و خودی است زیر خاک ہا، شرار زندگی است

"نور" کے اس نقطہ سے انسان کے پوشیدہ امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ اور یہ شرار
اسے نفس سر جی دکھاتا ہے اور خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور جب یہ سوز و دروں جو
مشق سے مہارت ہے ممکن کے ریشہ ریشہ میں اس طرح سما جائے جیسے شائع گل میں باد سحر کا ہی کا
نم، تو چہ وہ اس خاکدال میں رہتے ہوئے بھی خاک کی نہیں رہتا بلکہ یہ شرار اس خاک کو سہانوں کی

یہ زور ہے اور اس نے اس شرارت سے بچنا نہ سوجھا تو پھر یہی خاک اس کا سر رہن جاتی ہے۔

سارا وہ نامیدار یہ ہے یہ ایک بخت ہے یہاں مراد نجم کا لہسن ہے جس سے اشارہ مل جاتا ہے۔

مراد نجم تو راہ لہ با، عیند و باشی کہ بہ خاک تیرا زور و شرار خود را
تیرے نام سے سارے تار کی سج غریت میں جھکنے کی بات بڑی مضنی ہے۔ یہ ٹوٹا ہوا
تارہ زمین سے ہوا میں مدغم ہو جاتا ہے ایک نئی سج سے نمودار ہوتا ہے۔

سارا اپنے آخری شعر میں تیلہ عروج پر پہنچتی ہے لیکن اس شعر پر آنے سے پہلے ایک
بات یہ آجیدان ببول۔ آپ نے مٹے یہ بات پیش نظر ہے کہ یہ نظم اقبال کے اردو اسٹین
کا ترجمہ ہے اور نئی شرفی یا کارنگھوں میں ہسپانیہ، رقی کی ادا، مسجد قتب وغیرہ ہیں۔

اس بار کی نگہوں میں ایک بات مشترک ہے اور یہ بہت اہم ہے۔ اسپین پر مسلمانوں نے
جیت کر اٹلی کی اور ایک ایسی تہذیب عطا کی جس کی چمک دمک ساری دنیا کی نظروں وغیرہ سرتی
رن۔ لیکن یہ تو مسلمانوں کی حکومت باقی رہی ورنہ اس تہذیب کا تسلسل جاری رہتا۔ اسپین میں
مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے آثار قبوں کے اپنی آنکھوں سے دیکھے اسپین کی غلوں میں نہیں آتی
تاکہ یہی رہیں مٹی "حرق کی دعا" کا تو خیر، سرتی کیا۔ ابھی میں ہسپانیہ والی نظم کے چند
شعر پیش کر چکا ہوں۔ اس کا ایک شعر یاد آنا چاہتا ہوں۔

چرتیرے سینوں کو ضرورت داتا ہے کی باقی ہے بھی رہے میرے خون ہجر میں
مسجد قتب کے آخری بندہ بھی دیکھے جہاں اقبال دریا کے سرے کے سارے ایک اور
زمانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ جو ابھی پردہ تقدیر میں ہے لیکن اس کی سحران کی ٹکاموں میں اب
نصاب ہے۔ ان کی نظر میں وہ سارے انتہا بات جن سے خود مغرب ٹر رہا ہے۔ اور وہ آج کے
اور میں بات کے وجود و کرب و محسوس کرتے ہیں اور ان اخطرات کی گروہوں میں مذمت تبدیل اور
پیداری محسوس کرتے ہیں۔ یہاں یہ محض ایک خواب دیکھنے والے افغانی یا ایک جذباتی شاعر کی خوش
فہمی ہے یا ایک صاحب سیرت کی طرح وہ مستقبل کے عکس کو اپنے آئینہ راک میں دیکھتے ہیں۔
ور یہاں اس نظم کا پہلا بند اس شعر پر ختم ہوا تھا کہ "ساتی ترانم سحر ہوا" اب دوسرے بند کے آخری

شعر میں نغمہ اپنے عروں پر پھٹتی جاتی ہے۔

مومن سے جہاں کی حد نہیں ہے مومن کا مقام ہے جس سے
نیلنِ قبول سے اس کی شریعت بھی بیان نہ کی ہے۔ اس دین کی حقیقت احتسابِ مہانت
نے اور مومن کو بے حجب زمانے کے رومنِ عمل کا حساب کتاب ہے۔ قبول کا "مومن" مومنِ حقیقی اور
مثالی ہے۔ یہ اپنی خودی کا حق بھی ہے اور شمس کی قوت سے سرشار ہو کر یہ مہار سب بھی بنتا
ہے۔ اور جس کی زبان خدا ہے آفاق بنتی ہے۔ وہ زمین سے پوست بھی رہتا ہے اور اس سے
ماوراء بھی ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں قوس کی حیثیت نظر ایک مرنی پڑتی ہے جو مذہب اور اس سے
تبدیلی سے منہ سے اجڑتا ہے۔ چرخِ مجبور سے ارادت کی ریشہ و اس کی ماورائیت ایک طرف
آفاق کی اعلیٰ میں اس کے ظہور ہے بناہ قوتوں کی ترجمان بن جاتی ہے۔ قرآن مجید میں
اس حقیقت کا بیان کرتے ہوئے ایک ارادت سے تشبیہ دیتی ہے جس کی جڑیں زمین میں منہایتی
ستھ جھکی ہوئی ہیں اور جس کی شاخیں آسمان سے پسیدہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔

ترجمہ۔ یہ آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ نے کلمہ حبیب کی نیکی مشا بیان فرمائی ہے۔ وہ مشاہد
ہے ایک پائندہ ارادت کے جس کی جڑیں خوب بڑی ہوئی ہوں اور اس کی شاخیں دنیا کی پر
جاری ہوں۔ (۲۵۱۴)

یہ آیت اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ حقائق یا ابدی اقدار ثابت اور قائم رہتے ہیں
لیکن اس تبدیلی ہونے والی اس دنیا میں اسکے ظہارات manifestations بدلتے رہتے
ہیں۔ اس واقعہ کی گہرائی پر گہٹے کیلئے اس کی معنوی وسعتوں کا احاطہ کسی خاص زمانے میں ممکن ہو پر
ممکن نہیں۔

عبدالمومن دل نے مجھ کے پہلے ارادت سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

نشاءات بارض انت فیہا غریب

یہاں اقبال کی یہ تنہا کی "غربت کی ہوا میں بارور ہوا" ہمیں ایک بلیغ حدیث کی یاد دلاتی

ہے جہاں رسول اکرم ﷺ نے اسلام کو "غریب" فرمایا ہے۔

یہاں غربت نفس، جہنیت، تنہائی اور غریب الوطنی کا نام نہیں ہے اور نہ اس کا نام روائتی

غربت یعنی تنگ دستی ہے۔ بلکہ اس کے معنی قدرتِ قدر و عمل کے ہیں جو ہر زمانے میں نیا نہاں ہوتا رہتا ہے۔ ”مرے الفاظ میں اس کے معنی اسلام کی ابدی قدروں کو ثابت اور قائم رکھتے ہوئے اس کا زمانی نہاں رہے۔ اقبال نے جاوید نامہ میں اس حدیث کی یوں تشریح کی ہے۔

از حدیث مصطفیٰ داری نصیب احسن خلق اندر جہاں آمد ”غریب“
 بات وہ معنی اس حرفِ خبر غربت دیں نیست تر اہلِ ذکر
 ہر کس سے کہ صاحبِ بہتوست غربت دیں قدرت آیاتِ اوست
 غربت دیں ہر زماں نوعِ دگر ننگہ را دریاب اگر داری نظر
 دل بہ آیاتِ میں دیگر بہ بند تاگیری عصرِ نو را در کند
 و یا اقبال کی اس نظم سے یہ نکتہ بھی اجاگر ہوتا ہے کہ جس طرح ایک انجمن سرزمین میں
 کجیور کے درخت نے اپنی حیات کا ثبوت، یا اسی طرح اسلام کے امکانات کا اظہار بھی باقی ہے۔
 جن کو زمانے کی زندگی حقیقت بنتا ہے۔

یہ ٹھہر چور کے درخت کی رمزیت سے شروع ہونی لیکن آخر تک پہنچتے پہنچتے یہ مکانی نقطہ
 نہیں رہ سکا۔ ملی آفاقیت میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ لمحہ ماضی کا لمحہ نہیں رہتا بلکہ ایک میل
 ہے یہاں وہیں جاتا ہے اور ایک ٹھنڈ کی مہم جوئی مومن کی تحقیقی استعداد میں داخل جاتی ہے جس کے
 امکانات کا ظہور ابھی باقی ہے۔

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
 مومن کا مقام ہر کہیں ہے

”ذوق و شوق“ ایک مطالعہ

قلب و ذوق، شوق، ایک یہ حسین اور دلکش شعری پیر ہے جس سے متاثر ہو کر
 دوران یوں محسوس ہوتا ہے کہ زبان کی رانجوں کی طرح ایک دور سے تپتے ہوئے
 تیز کی آواز سے جتنی چلتی ہے اور زمین میں نہیں وقوف اور قیام پر، شوق اور شوق
 قادر تر ہے اور اس سے، بنا بات کی شدت اور فانی اب یہ تاثر و رجحان کی مدد
 ہے۔ قلب و ذوق کی تک پہنچ کا مدد بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ اس تجربہ کی تہات
 آپ بھی ہیں۔ یہ ان کی حیثیت میں اس شعر کے نفس استواری اور مدد کو سمجھنے میں
 کام قبول کے نفس مشہور شاعرین کی مدد ہے۔ لیکن وہ وہاں ذوق میں جھٹکتا ہے۔ یہ
 تعمیل، شدت اور مدد پاتی حسین سے وہ پیکر جو اقبال کی شاعری کو پرکھنے اور اس کی قدر
 و قیمت دیکھنے کے لئے تیار ہے۔ یہاں کافی ہیں۔ ”یا اقبال کی شاعری، اس کے
 شریع اور نصاب کے جو اور معیارات کا تعلق کرتی ہے“ بات اور بھی آشوار ہو جاتی ہے جب
 ”حدیث شوق“ دیکھنے کے لئے اس کے وجدانی سرچشموں، شعر انداز کر دیا جائے۔ یہاں قبول
 کے یہ اشعار شاید بے نکل نہ ہوں گے۔

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم
 نغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

زبوروں در گذشتم ز درون خانہ کفتم
 سخنے ناگفتہ را چہ قلندرانہ کفتم

نہیں نہیں کسی نیا کا لہجہ فکر کے عمود تک عدم رسائی، مختلف بندوں کے معنوی رعب کی
 تلاش میں عجز رہا ہے۔ کی وجہ سے مسخ آمیز بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر اقبال کا یہ شعر بے
 ساختہ یاد آ جاتا ہے۔

کس عداوت کہ من نیز بہائے دارم
آن متاعم کہ شود دست زد بے بصران
شاید اسی سے اقبال کا مٹا ہوا ہے کہ فتوحات جہان ذوق و شوق لینے جذب وروں کے
ساتھ کیا، شوق بھی چاہئے، بخش خرمندی کافی نہیں۔

بادلِ ما چہاکنی کہ تو بہ بادۂ حیات
مستی شوق کی وہم آب و گل پیالہ را
(آپ نے میرے دل کا کیا حال کیا۔ آپ نے باد و حیات سے میرے بدن میں مستی
شوق پیدا کر دیا)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
”سپہمازہ برائیمہ ماز وایت عشق“ کا خرد مستانہ بند کرنے والا اقبال۔ ”بہت مت مر سیدم
تو بہ بانجہ“ لیتا ہے۔ ظوف باصو درمن سعادت خرد است۔ اگرچہ ”سہ تر اشد قلندر کی مانند“ بہ
مرستہ مستان سے ”یک دہا غررش“ کی دعوت دینے والا، قبال یہ بھی جتھا دیتا ہے۔

بیا کہ من ز خم چہر روم آورد
مئے سخن کہ جواں تر ز بادۂ غمی
اس پس منظر میں شاید کہا جاسکتا ہے کہ ذوق و شوق جیسی نظمیں خدا و نمر کے لئے منہاج کی
ضرورت تھیں۔ اس آتی ہیں۔ اس جملہ معترضہ کا متعدد مطالعہ قبال اور اقبال شناسی کے سفر میں
یک بسم کی و شواہدوں و اقبال شناسوں کی خدمت میں پیش کر دینا ہے۔
ستار چین نے اس نظم کو نعتیہ قصیدہ یا سفر جہاز کا بدن بھی کہا ہے لیکن بخش کلیدی ترکیب اور
ستاروں کے تجربہ اور جہیز میں اس مرکزی خیال سے رشتہ باقی نہیں رہتا اور نظم کے محور سے اس کے
مختلف بندوں کا معنوی رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے شاید نظم پر غور کرنے سے پہلے چند بنیادی باتوں کا
تعمین ضروری ہے۔ خود اس نظم کا پس منظر اور عنوان بھی نظم کے خود تک رسائی میں مدد دیتے ہیں۔

”ذوق و شوق“ اقبال کے سفر فلسطین کی یادگار ہے۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس
میں شرکت کے بعد موٹروں لم اسلامی کے سلسلے میں وہ فلسطین پہنچے۔ اجلاس سے پہلے نام اسلام

نور اور روشِ شب۔ جو سیر کی ہے متوجہ رقصیدے کا یہ شعر اس موقع پر سب جانے ہوگا۔

ام حبیب الريح من تلقاء كاظمة

او اومض البرق في الظلماء من اضم

(ترجمہ)

یا مگر از کاظمہ بادے وزید از کوئے دوست

یا مگر در نیم شب برقے چیدہ ز اضم

(جائی)

قبول ہے اپنے حسن کارانہ انہار کے ساتھ وہ انحراف روانہ کا فکر کے ساتھ تھوڑی کیفیت
ہوئی ہے۔ وہ پہلے بند کی پوری فضا سے معنوی طور پر ہم تنگ ہیں۔ اس شب کی تھوڑی
ہوئی ہے۔ وہ انحراف طیاروں کی تشبیہ کے انحراف تقدس، وقار اور عظمت میں ہے۔ رستہ کی
بارش کے یہ میل ہو گیا ہے، رانی فضا کے یہ پست ہوئی ہے اور تانہ کی ریت شعلہ پر نیوں
نرم بن گئی ہے۔

اس سے ندرت ہو کے شاعر کی نظر بگھٹی ہوئی آگ اور نیوں کی ٹوٹی ہوئی خانوں پر
پڑتی ہے۔ وہ دن و شوق کے اس سفر میں اس مقام پر پہنچتے ہیں وہاں آگ اور نذر کے اس کے
تھوڑے ہوئے آثار ان کی یاد دلاتے ہیں۔ تاکہ وہ اس کی تھوڑی ہوئی سکتی گزریوں کے
سوڑوروں کی غماز بن گئی ہیں۔

آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

پچھلے اشعار کا سراسر منہ اندی مت مرکب ہے۔ یہاں ہے جو راہ شوق میں ہر دم نہ کارواں

کی منزل ہے۔ یہاں روح القدس کی یہ بھی آواز قبول کے اس مقام کی شہادت دیتی ہے۔

آگ صدائے جبریل تیرا مقام ہے یہی

اہل فراق کیلئے عیشِ دوام ہے یہی

دشت میں صبح کی نمود، چشمِ آفتاب سے رواں نور کی ندیوں کی تہہ، زمینیت اور مقام

منسوری کی کیفیت کے غبار کے بعد اس کے بند میں معارفِ تقدیر کی بازی لگ رہا ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ اگر اقبال کی ساری عمر میں وہ ہمیشہ ہی اپنے اپنے
 گروہوں کے لیے اپنی تعلیمات و عقائد کو پیش کرتا رہا ہوگا۔ لیکن اقبال
 کے لیے یہ سب کچھ ایک ہی چیز تھی۔ وہ اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کرتا تھا۔
 وہ اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کرتا تھا۔ وہ اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کرتا تھا۔

در مصافحہ پیش آں کردوں سریرِ دضر سردارِ طئے آمد امیر
 پاکے در زنجیر دہم ہے ... بود کردن از شرم و حیا ثم کرد ...
 دخترک را نمی چوں بے پردہ دید ... خود پیش روئے او تہ
 اب یہاں اقبال کی یہ دل دوز آہ اچانک بدلتی ہے

ما ازاں خاقانِ طئے عریاں تریم
 پیش اقوام جہاں ہے چادریم
 میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔ میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔
 میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔ میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔
 میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔ میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔

میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔ میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔
 میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔ میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔
 میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔ میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔

ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
 نے عربی مشاہدات نے انجلی تخیلات

میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔ میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔
 میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔ میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔
 میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔ میں نے اپنے لیے ایک ہی چیز کو پیش کیا ہے۔

معنویت کی تلاش ضروری ہے۔ اس میں عشق کا سوز و ساز بھی ہے اور رمانٹک شیعہ کی بھی۔ یہ آتنی دور کے مسرے ہیں۔ ماسوائے ان کی نظر آری کہ انہیں اس بات کی کوئی فہم نہیں ہے کہ جس عشق کی روئے سے جاری ہو، شین وین بھی تصورات کا بہت مدہ ہیں گئے ہیں اور تالیف قلم۔ حجاز کی افسردگی کا علاج اقبال کی اس نوا میں ہے۔

ریگِ عراق منتظر، کشتِ حجاز تشنه کام

خونِ حسینؑ باز وہ کوفہ و شام خویش را

غیرت عشق کی اور ان کی محبت وہاں میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ مذتِ شامی وہاں سے نہیں بہہ سکتا۔ ایتنی ہے۔ شہدِ نمرود میں تیرے صدقِ تیل کنڈن بنتا ہے اور میدانِ روم میں عشقِ حیدر اپنے خون میں بہا کر سرخ رہتا ہے۔ وہ یہ طشت ہے مرے محسوس و روحیات کی بنیاد عشق پر استوار ہے اور اس کی آبِ حیات کی خونِ حسین سے ہے۔ عجب سے کربلا تک اس سنہ میں اتنی معنویت پیدا ہوئی ہے۔ صدقِ نبیل اور جبرائیل کے ساتھ بدرائین کا اس شعر میں تذکرہ اس حیثیت کی بھی یاد دلاتا ہے کہ عشقِ نفس کی تہائی سے مہارت نہیں بلکہ بدرائین کی معرکہ آرائی کا بھی نام ہے۔

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق

معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اسی کے تیرے بند میں اقبال نے ذات رسالت کا پست و سرفراز ہونے کے روبرو وہ بدستور کرنے کی بات کہی ہے۔ تیسرے بند کے آغاز میں اقبال نے ذاتِ ختمی مرتبت کو اپنے لئے "یہ کائنات کا محض دریافت" کا نام دیا ہے۔ اس استعارے کی تعبیر میں یہ کائنات کائنات ہے جس کی تلاش میں رہنے والے کو اپنے لئے "یہ کائنات" کا نام دینا ہے۔ اس سے مراد اٹھنا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان خلاصہ کائنات ہے اور تحقیق و ارتقاء کی آخری منزل۔ ثاناً یہ کائنات میں کوئی معنی نہیں پیدا ہوتے جب تک کہ "مظہرِ لواء" نہ ہو۔ تصورِ مہرِ منت کا بھی تصور ہے کہ تمام کائنات ایک ایسی ہستی پر ختم ہوں جو تمام سماج و صناعات کی مظہرِ اتم ہو۔ جاری کائنات کا خلاصہ بے شک انسان ہے، لیکن ہاں انسانیت کی تربیت انبیاء کرم سے آری ہوئی رہی اور اقبال کے نزدیک مختلف انبیاء کا نبوہ وراصل مدارج محمدیہ علیہ السلام کا تذکرہ بھی نبوہ رہا ہے۔ صاحبِ کشن رائے نے بڑی خوبی سے یوں اس رمز کو سمجھا دیا ہے۔

نبوت را ظہور از آدم آمد

کمالش در وجود خاتم آمد

اس بند کے پہلے شعر سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ ذاتِ انسانی مرتبہ ہی نہ انسانیت کا معنی اور یہ بے درمتناہ و منزل پر راہ و راہ سے اور تلاشِ معنی سے اس کا سفر۔ تلاشِ معنی محض ایک سوئی ٹپا نہیں بد۔ مسلسل حرکت ہے۔ اس بند کے دوسرے ہی شعر میں اقبال نے یہ فریاد بھی ہے۔

خلوتیان مدرسہ کور نگاہ و مُردہ ذوق

جلوتیان مئے کدہ کلم طلب و تہی کدو

تہی رندان کے خارجی اور باطنی پہلوؤں میں رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ دونوں براہِ حرکت و حیات سے باری ہیں۔ ایک کی ذمہ داری خارجی پیلر کی برقاری و تھنڈ سے ہے اور دوسرے کا تعلق باطن کی شہدائی اور خفائی سے ہے۔ لیکن جزییات اور فروعات پر غیر متوازن اسرار نے قافیہ حیات و معاد کی رو سے ہٹا دیا ہے۔ نہ تو مکتبوں میں روحانی افکار رہے اور نہ نائنٹیسوں میں لذت سرور۔

اثما میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک

نہ زندگی، نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اس میں منظر میں اقبال کی نوا کا مقصود، اسی آتشِ رفتہ کا سراغ ہے جس کے وجود سے تب و تابِ زندگی اور حرکت و حرارت قائم تھی۔

میں کہ میر کی غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ میر کی تمام سرگزشت کھوے ہوؤں کی جستجو

باہر صبا کی موج سے نشوونما کے خار و خنس میر کے نفس کی موت سے نشوونما کے آرزو

خونِ دل، جگر سے ہے میر کی نوا کی پرورش ہے رب ساز میں رواں صاحبِ ساز کا جوا

کھوے ہوؤں کی جستجو، روحِ حیا، پسندی اور ماضی پرستی نہیں بلکہ ان ابدی قداری

بار یافت ہے جن پر انسانیت کی بنیادیں ستوار، دیکھیں، ماضی کے تجربات سے روشنی حاصل کرتے

ہوئے، اسے حال کا جز بنانا ہے اور ایک نئے جہان کی تعمیر کا حوصلہ اسی سوز و سازِ رز و سے ملتا ہے،

جس کی نشوونما شاعر کی موجِ نفس سے ہوتی ہے۔ اقبال نے ایک مہر پر کہا تھا۔

کی شٹ جہانی کی جھلکیاں ہیں۔

قیام اور جہد کے استعارے بھی اقبال کے ہاں معنویت سے بھرپور ہیں۔ قیام میں
جس جہان میں بد و بھلاں بندوں سے بھارت ہے اور یہ دونوں پہلوں سے مشغول ہے
مستعربین

فقر و شاہی واردات مشغولی است یہ بقیہ سے است مشغولی است
ایں دو قوت اثر وجود موئن است یہ قیام و قس و قس مشغولی است
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں

نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں

نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں
نہایت شہنشاہوں سے بھارت ہے بد و بھلاں کے یہ دونوں پہلوں

تیرہ دھارے جہاں گردش آفتاب سے
طبع زمانہ تازہ کر جلوہ بے حجاب سے

یہاں اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ آئی کے سر کا ایسا یہ ہے کہ اندر کا وہ

اپنے عمل کوئے نے دعویٰ کر رہا ہے اور ہرگز اپنے ہر عمل کی اجازت اسے ایک دگر نہائی رہی ہے۔
 ٹرانڈا اور بات ہے۔ اس سے اس بند میں اقبال کی اتنا کہی ہے کہ ریش آفتاب سے اس کی دنیا
 روشن نہیں ملتی۔ اس آفتاب سے زندگی کا یہ رخ منور ہوتا بھی ہے تو وہ ریش تاریکی میں
 رہتا ہے۔ اس خورشید باطن دونوں کے ٹکڑے اور شہابی سینے آپ ہی کے چھوٹی تو یہ پائے تاکہ
 زمانہ ایک نئی زندگی سے ہم غار ہو۔ مشرق کا ریش نکلے کی یہ رہا در مغرب خورشید میں سیا
 قبال انسانی حیات کے مختلف پہلوؤں کے درمیان میں تو زن اور وحدت کی عارفانی ہیستے
 ہیں اس کی معانی انہیں ذات رسالت آپ میں قی ہے۔

آخر کی بند ہے کہ میں اقبال یہ عرض کرتے ہیں کہ عجب جستجو میں ایک مہرہ رہنے کے
 بعد مجھ پر راز کھاتا ہے۔ عمر شجر ہے اور ترقی ہی اصل حیات ہے۔ یہاں عمر شجر اس شجر حیات
 میں آسن نہیں رہتی بلکہ اس زمانہ کا ریش کے ہاتھ میں ہو تو قفہ حیات ہے وہاں انہیں تک
 پہنچ سکتے ہیں۔ اور میں جی عقل اور عشق کا یہ معرکہ تازہ ہے۔ قبال کے نزدیک ہر وہان شوق
 کی مثال عشق کی ہے اور اس میں تب تک مدد رسان ہو سکتی ہے۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُست

اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست

اس عشق کا مہرہ بھی ٹیب ہے کہ کوئی تو منوں کی جستجو میں غم نزار دیتا ہے ورنہ بھی یہ حال
 ہوتا ہے کہ ”اٹھے شود جاوید صد سالہ آہے“۔

اور سے بند میں بھی اقبال نے عشق کی اہمیت پر زور دیا لیکن وہاں اس کی سمت عالم
 تاریخ ہے اور یہاں اس کی جہت عارفانہ ہے۔

اب یہاں نظم کا اہم ترین پہلو ”فراق“ جا رہا ہے۔ عام ساز و ساز میں وصل کی نہیں،
 فراق کی ہیست ہے۔ فراق ہی نکوین اور تکمیل کا سبب ہے۔ اقبال کے نزدیک انسانی خودی کا
 استحکام فراق کی بدولت ہے اور فراق عشق کا آئینہ دار ہے۔

جدا لی خاک را خشد نکاہے دہم سرمایہ کو ہے کہ ہے
 جدا لی عشق را آمینہ دار است جدا لی ششک را سازگار است
 فراق سے پہولی مار فائدہ بہت کو اقبال نے نگلشن رز جدید اور زبور مجسم کے کئی اشعار میں

شیں یہ ہے۔ اقبال کا سن ہے کہ فراق کی بدولت فنا، بت سے ہم دوش ہوتی ہے۔

یہ خوش سودا کہ نالد از فراقش لیکن ہم بہالد از فراقش
خودی را تنگ در آغوش کردن فنا را بقا ہم دوش کردن

نصرت و کشتے میں شاید ڈالو مابہ حسین کی س و خداست سے مدد مل سکتی ہے۔

مستحق و تعین منہ میں ہوتی ہیں، آرزو، بہشت، دیدار واصل، قدیم شعراء کے یہاں اس تیسری منزل کا تصور یہ ہے کہ طیب، مطلوب کے اندر اس طرح فی سوجا کہ جیسے قند و درہ میں جو مہکتا ہے اور نہ مہکتا ہے۔ محدود اور محدود کے اصل و اس کے سوا کوئی قصہ رچھی نہیں ہو سکتا۔ مگر قبال سے یہ ایک مستحق کی طرف، وہی منہ میں ہیں۔ پہلی منزل سوز و انداز ہی ہے اور دوسری کیفیت دیدار جو دست و پنش بھی ہے وراٹھراپ افزا بھی۔ تیسری کوئی منزل نہیں۔ لذت دیدار سے ہمیشہ بے ہوشی کے بعد نفس انسانی روح مطلق سے جد رہتا ہے اور روح چھائی سے تڑپتا ہے۔ یہی اس کی فطرت اور طبیعت کی تقدیر۔ (پہوالیہ مجلہ، ر، اقبال نمبر ۱۹۳۸ء)

نصرت یہ تفصیل میں پرانی فیسرہ منہ و میر کی کے وہ نکتہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس پہلو کو یوں پیش کیا ہے ”اقبال خواہ اور نہ مانے کے تناؤ کی برقراری ہی میں انسانی نسبت کی تکمیل کے امکانات نظر آتے ہیں۔ اس لئے وہ ایک ایسے مروجہ مومن کا جو یہ ہے جو بے حساب سے موت فراق کی جانب واپس آنے کی طاقت رکھتا ہے جس میں تخلیق کے امکانات پوشیدہ ہیں۔“ (اقبال کشش اور گریز)

فراق قبال کا تھا محبوب، مومن رہا ہے۔ انہوں نے خواہہ نفس نیلی کو مانا تھا۔ انیسویں صدی کے سچے ”سراغراتی“ کہا جائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کی نفس، قدریں کے نفسیاتی تجزیہ کے ضمن میں تہذیبی اور سیاسی سطح پر بھی فراق کی کارفرمائی دیکھنے کی دسترس ملے۔ اب ”ذوق و شوق“ کا سلسلہ منہ تک پہنچ رہا ہے۔ میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا۔ یہ شوق، ذوق، منہ و فراق کے تناؤ کے درمیان آئے پردھتی ہے۔ اس کشش کا اظہار قبال نے کرتے ہیں۔

نہیں وصال میں بھی، مجھے حوصلہ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی، میری نگاہ ہے ادب

وہ دیکھ کر ہلکے دم سے ریوڑ اترے۔ ان سے قیافہ اتنی سے نہ ملتا۔
سے متاثر نہ ہوتے ہیں کہ اس میں لذت طلب ہے مسلسل مشغول۔

رہی آرزو فراق، شورش ہائے دہو فراق
 مون کی جستجو فراق ، قطرہ کی آبرو فراق

افسانہ نگاروں کی تالیفات میں یہ افسانہ قابلِ غور ہے۔ اس میں
 ایک ایسا ہیرو ہے جو اپنے دور کے مسائل کی جھوٹیں ٹھکانے، فحشیت کے
 نیشے ٹھکانے کی ترقی یافتہ صورت کو ایک نہ چہرہ ہیں وہ ان دنوں پھوس کا پیدار ہونے کا
 ایک سنگین نمونہ ہے۔ اس میں ایسا ایسا احساس و بات ہے کہ ہر انسان کے
 دل میں اس وقت میں اسٹیم ہو رہی ہے۔ اس میں کچھ اوقاف و مقامات ہیں جن میں
 یہ نامور مرد ایک نو پسند ہونے کے دوران کی انوکھی کہانیاں ہے۔ ہر باب کے
 جاتی جاتی ہونے کے باعث اس کی خدائی سننے کے بعد دیکھنے سے یہ بات سننے والی کے
 بسباب اس میں ایک چارنی ہو گئی ہے۔ یہیں کے ہر افسانہ قابلِ غور کی پوری معنوی حیرت کے
 آئینہ دکھاتی ہے۔ اس میں تو مری اور مری کی روشنیوں میں ٹھکانے کی باتیں، انسانی
 تڑپوں میں یہ خوف ہم کے زہریلے ہونے پاتی ہے۔ یہ ہے کہ ہر افسانہ نگار ہی ہر افسانہ
 دیتی ہے۔ (اقبال ریویو۔ اپریل ۱۹۹۳ء)

ہم اقبال کے وجدانی اور تخلیقی سر میں ان کے ہم سفر ہیں! جذبات معنی اور قدرت فکر کی نئی منزلوں سے گامہ ہوتے ہیں۔ مذہبی شعائر کے خاتم کی پہلوئی نہ قدرت اہمیت اور اخلاقییت مسنم، مٹانے کیوں کہ ان سے انہیں پہلو سے انہیں بیان یہ ہے ان کا تعلق باطن کے مکمل اور خدائی سے ہے جو انسان کی خردی اور اجتماعی زندگی کے دونوں پہلوؤں سے مربوط ہے۔ اس قدر وضاحت کے بعد میں اپنی بات کا آغاز اذان سے کرنا چاہتا ہوں۔

بات ابتدائی شاعری میں شاعر فطرت کا ہر ذرہ اپنے آپ کے ذہن میں یہ سمجھتا ہے کہ یہاں انہوں نے سمجھ سہیل دی وہ موزن و راتے موزن سے تشبیہ کی ہے

جا کے کوئل کی اذان سے طائرانِ نمرنج

ہے ترنم ریز قانون سحر کا تار تار (نمود صبح)

بچیلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موزن

میں اس کا ہم نوا ہوں وہ میری ہم نوا ہو

اسی طرح کھستان میں ٹپ ٹپ سوجھ سے موزن ہے کہ اس کی چٹک اذان سحر کی طرح صبح صادق کے طلوع ہونے کا اعلان ہے۔

چٹک اونچے گل 'تو موزن ہے گلستان کا

اقبال کی ابتدائی شاعری میں اذان اور موزن کی تشبیہات کے اس حوالہ سے فکر اقبال کے مد رتبی ارتقاء کا پیلوہ بنے ہوتا ہے۔ اب آئیے راست اقبال کی اس نظم کی طرف جو پال جہریں میں شامل ہے اور جس کا عنوان بھی "اذان" ہے۔

یہ نظم ہیبت اور استعجاب کے اعتبار سے انوکھی ہے ورنہ ذرا مانی کیفیت کوئے ہوئے ہے۔ اس ڈرامہ کا اسٹیج انہوں نے فصاحت سے بھرا ہے اور اس کے کردار ہیں "نجم سحر" یعنی صبح کا ستارہ، مرتضیٰ زہرہ اور مہرہاں۔ وقت صبح کی آمد کا ہے مثالہ کا انداز یوں ہے کہ نجم سحر آدمی کی کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

اک رات ستاروں سے کہا نجم سحر نے

آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے بھی بیدار

آہ مائیں مرغِ پتو پزار سا نظر آتا ہے۔

کہنے لگا مرغِ ادا فہم ہے خدیو

ہے غیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار

روشنی سے ہر دست جواب دینے کے لیے چھٹا پڑتا ہے اور یوں غلطی رہتا ہے۔

زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں کیا۔

اس کرمکِ شب کور سے کیا ہم کو سروکار؟

کرمکِ شب کیسے ہے مرغِ ادا؟ وہ تو توں سے توں سے نہ سرف بیانیہ آتے ہیں

پہلے تو وہ پتوں سے نکلتا تھا اور قیاس سے ہے۔ لیکن مرگاہل پر اعتبار کرنا ہی مرگاہل کی مرگاہل سے

توفیق دیتا ہے توں کی ہمت مہاشاں اور اس کے سر سے آہ مائیں کا جواب ہے۔

بولا میرِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی

واقف ہو اگر لذت بیداری شب سے

اوپچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پڑا سرار

آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں

کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار

اب اس آخری شعر پر غم ڈرامائی انداز سے ہوئے اپنے ڈرامے کو پیش کرتے ہیں یہ فاضل اقبال

کی خوبی ہے۔

ناگاہ ! فضا یا بگ ازاں سے ہوئی لبریز

وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دل کو ہمار

مرگاہل کے اس جواب کی کیا معنویت ہے اس بات پر اسے غور کریں اور اس سے قبل شب

کلیجہ کے یہ قصیدہ ”صبح“ کے علاوہ ایک اور نظم ”عالمِ نو“ کا مت لکھ کر میں تاکہ اس کو بھی قارئین

ازاں کی معنویت کے مختلف پہلو واضح ہو جائیں۔

”صبح“ کے نام سے موسوم قطعہ جو پال میں لکھا یا مسبدوں کے شہ بخوپاں میں مصوٰطہ پڑنے

سے لکھی گئی ہے ان ازاں میں ”قبل کے دل میں ایک سوز و سرور اور وجد و انبساط کی عینیت پیدا

ہوتی ہیں۔ اس بات سے وہ مسرت اور ہلکا ہونے لگتا ہے۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے، کبھی ہے امروز

نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شہستان وجود

ہوتی ہے بندہ مومن کی ازاں سے پیدا

صبح کہاں بکھڑا ہوتا ہے، صبح خیزہ امیشی اور خواب سے بیداری کا لمحہ ہے۔ ظلمات کے

نور میں مل جانے کا وقت ہے رفاقت اور شہابی سے عبارت ہے۔ نہیں سنا ہے، جن میں

نہیں جو روز نمودار ہوتی ہے۔ بلکہ یہ صبح وہ صبح ہے جس سے ہاتھ پاؤں مل جاتی ہے۔ یہ صبح ہے

جو قلب انسان زندگی پر اس شادی کے قلب کی شادی کا وقت، شوق کا یہ آئینہ ہے

زمین میں تازہ ہو گیا ہوگا۔

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں

چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

خورشید وہ عابد سحر خیز

لانے والا پیام بر خیز

یہ آفتاب نہیں جو ہر روز صبح و غروب ہوتا ہے بلکہ

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے

دل ہے، خرو ہے، روح رواں ہے شعور ہے

نقشہ ہے پتے شہر میں تپانے کا اور نقشہ پہلو ہے کہ کہاں کون سے پتے ہیں

جو سدا و زبیدی ہے۔ یاد وہ سحر جو ایک جہان تازہ کی آمد کی سیل ہے۔ شہستان وجود نور

کے سحر خیزانیت سے عبارت ہے جہاں تاریکی ہے سناٹا ہے بندہ مومن نور انوار سے مستنیر

ہے انسانیت کے آفاق میں سنی دیتی ہے۔ شہستان وجود میں ارتقا میں مومن کی ازاں کی

ادب سے پیدا ہوتا ہے اور اس اس بیداری کی علامت بن جاتی ہے جس کی کوئی سر سے آفتاب

میں سناکی دیتی ہے۔

دنیا کی عشاء ہو جس سے اشراق

مومن کی اذان ندائے آفاق

ہاں بہاؤ کی نگہ "اس" اور شب کلیم کے اس قطعہ کے نثری اشعار کو دہن میں رکھتے
ہم سب سب آسپ شب کلیم کی نظم "مرد و زار" پر یہ نظم بھی نہایت مختصر لیکن قیمتی
اور صرف تین اشعار پر مشتمل ہے

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر

خواب میں دیکھتا ہے عالم نو کی تصویر

اور جب ہانگ اذان کرتی ہے بیدار اسے

کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر

بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کف خاک

روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر

تقدیر یعنی وہی ہے مومن دل زندہ سے پوشیدہ نہیں رہتی تقدیر کے ہوتے مستقبل کی طرح اس
کے سامنے ہوتا ہے۔ یہاں ہم نے خیال میں خوب ایک Vision ہے اور مومن ایک
Visionary ہوتا ہے۔ اس طرح ان یہاں خواب سے بیداری اور اس کی عملی تعمیر ہے جس
نفس کے ہوتی تھوڑے میں اب آئیے اس کی معنویت اس کی مختلف جہتوں و سیٹ میں
ذرا ایک ذرا کی بشارت ہے۔ مستقبل کا وہ ترانہ اور تازہ مستعدیت، جس کا سوا و سر و یک نئے
عالم کا تصور ہے۔ ان لذت بیداری شب کے ذائقہ اور اسے کشا ہونے کے بعد بارے
ملاحوں میں یہ قدرت کی کثیف پیدا کرنے کے عزم کا اعانہ ہے۔ بدن قدرت و ربانی کے
اعانہ کے بعد جب جان بیدار مومن کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر نیا توان و تیز
کراہتی ہے جو اس کے ماحول میں برز و پیدا کراہتی ہیں۔ مومن وہ Visionary ہے جس
کی بصیرت کے سامنے مستقبل ایک کھلے ہوئے مکان کی طرح ہوتا ہے۔ جو کس قدر اس کے
باتحریز ہاتھ اس کے نہیں بیٹھتا بلکہ ایک نئی دنیا کی تعمیر کا عزم و حوصلہ رکھتا ہے۔ یہاں اس بات کی
وضاحت شاید ضروری ہوئی کہ اذان کے بارے میں یہ مضمیمہ اور رموز و اس کے حکمت سے کیا

یہ بات زندہ رہا، وہ منظر بکرو چکی ہے وہ سوال کرتے ہیں کہ اس دنیا کے آداب داخل سے رہائی کیسے مل سکتی ہے، واپس جتنی رسائی ہو کر ممکن ہے۔ روٹی جواب دیتے ہیں یہ ممکن ہے اور کتنے دنیا کے مسکین دیتے ہیں کہ ہاتھ آجائے جس طرح وہ رحم سے اس دنیا میں تیری یہ پیدا شدہ اس کی طرح رہا اور انسان کی حدوں کو توڑ کر ایک نئی پیدائش یعنی زادن نو ممکن ہے انسان کا اس دنیا میں یہ نہ تھا اس کے اختیار میں نہیں ہے انسان ایک نئی پیدائش اس کے اختیار میں ہے۔ یہ پیدائش یا اس میں نہیں ہے اور دوسری آسمان اور عیاں ہے وہ پائیدار ہے اور یہ باخدا ہے۔ وہ سکون اور یہ ندرت ذات ہے یہ۔ پاسیہ میں ترجمت ہے اس وضاحت کے بعد آپ اقبال کے صرف دو کلید کی اشعار سن لیں۔

ہردو زادن را دلیل آمد اذال
آں بہ لب گویند وایں از عین جاں
جان بیدارے چو زاید در بدن
لرزہ با اقتدریں در کھن

یعنی ہر دو پیدائشوں کی دلیل اس ہے کہ یہ دونوں سے نکلتی ہے اور اس کی عین جاں سے اس وقت سے یہ جان بیدار۔ جب کہ تن میں بیدار ہوتی ہے تو اس سے یہ جان بہنے لگتا ہے زماں اور مہاں سے بندہ سن ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہی زبان نو ہے جو خیمیت کی معرکے کی تمہید ہے جس کی دلیل بھی اذال ہے۔

اس کے بعد اب آئیے سلو تو کے سے مسجد یعنی مجدد کاہ کی طرف۔ اس بارے میں شاید ایک دو باتوں کا ذکر کرے کل نہ ہوگا۔

اس ماحول برتین سمیں "پیر کی مسجد" مسجدت السلام اور مسجد قہر اقبال کے تعلق سے کوئی بات کرتی ہیں لیکن یہاں ان کا تجزیہ متسود نہیں۔

"نور" اسماء میں ایک خاص رمزیت کا حامل ہے۔ نور جوہی، جوہی، تمثیل و رمزیت ہے جس کی Symbol of Divine Presence نور کی یہ رمزیت خصوصاً مسلمان یں من تقیر کے پیش نظر رہی چنانچہ من تقیر کی شاہکار مسجد میں رنگ و نور کا نہ تلاف اور انوکاس کا حسین اور نہیں انہار

انہیں معافی و رحیمیت کی زیارت ہوتی ہے۔ کہاں اس سڑ میں ایک قدم پہنچتے ہیں جس خوش و سعادت کے لئے ان میں پہنچنے والی نفسی اور روحانی ترقی نہ ہو انہیں کو اس بند ہوتی ہے اقبال راوی سے پہنچتے ہیں اس مقام پر حیات کے وہی تہذیبی تہذیب سے ہیں یہ اذان کی آواز کہاں سے بلند ہو رہی ہے۔

وہی وہ ہے یہ ہیں یہ شہت و لیا ہے۔ یہ خاکداں ہماری خاک سے آشنا ہے۔ یہ مقام حارثوں کی بات ہے۔ تا شاید میں صوبہ پاکستان کے خوب ہو جاؤں۔ دوسرے یہ بند نہ تہذیب ہیں۔ وہ اس سے ہوتے ہیں قیادت ہیں کہ اس مقامات قیادت میں ہم انہیں مدین افغانی اور مستند کی رحیمیت کی شہت خوش میں افغانی سورہ انہی کی حیات نے ہیں صوبہ پاکستان کے یہ تہذیب میں معراج نبوی کا تہذیب ہے۔ یہ منہ بہت ہی نفی ہے۔ اقبال سے ہیں یہ نفی کی قیادت میں دوسرے تہذیب ہے یہ شہت نشیں و بدیں تہذیبیں اور اس پاک پہل جہم نے۔ قلب داہ میں سورہ مستی کی شہت ہے۔ وہ ہے۔ اس پر عرق اوستا ہے کہ قبروں کے سکوت اور خوشی سے شہت ہے انہی۔

قبروں سے اس پر عرق اوستا ہے کہ قبروں کے سکوت اور خوشی سے شہت ہے انہی۔
 سورہ وانجم و آں شہت خوشی
 ران پاک جو نیک آید ہو جہ
 دل ازو در سینه گرد و ناہور
 شہر الا اللہ خیزد از قبور
 اضطراب شہد مخشد دورا
 سوز و مستی می دہد داود را
 آسمان بہ غیب از قیامت
 بے حجب مکتب ز قیامت
 متنبی مسافر میں قبروں میں نماز کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے کابل میں ہمارے شہید کی
 اقداس میں پڑھی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس قیام و سجدہ کے راز کو بجز "بزم مرماں" اوروں کے سامنے
 بیان نہیں کیا جاسکتا۔

وقت عصر آئے بعد از صلوٰۃ
 آں کہ مومن را کند پاک از جہت
 انتہا شہد سوز و کد ز
 کردہ ام اندر اقداس از نماز
 رز با آں قیام و آں تجور
 جز بہ بزم مرماں نتوان کشور

قیام و رہد

قیام و رہد ہر جگہ ہی کے بنیادی ارکان ہیں تاہم قبائل کے لوگوں کے اعتقاد میں وہ بھی نہیں
وہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ان دنوں کی صورت و شے یہ ہیں۔ اسے تھوڑی پہلی رہا ہی ہی
نہیں پاتا ہی ہے۔

شبید ناز او بزم وجود است

نیاز اندر نہاد ہست و بود است

نمی بینی کہ از مہر فلک تاب

ہر سیمائے سحر داغ وجود است

بدن و قلب کے مقام بندن سے آتے ہیں شقی تک نہ پایا ہے

مقام بندگی دیگر مقام ناشقی دیگر

زنوری سجدہ ہی خواہی 'زخا کی پیش ازاں خواہی

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام

میرا قیام بھی حجاب ' میرا سجود بھی حجاب

ارمغان میں انسان نے یہ ایسے سجدہ کی آرزو ہے جس سے زمین و آسمان و ہند میں آجائیں
اور جس کے سوز و حرارت سے پتھر بھی پگھل جائیں۔

سجودے آؤ کہ از سوز و سرورش

وجد آرم زمین و آسماں را

سجود سے نہیں ہیں آجائیں کہ اس خوش حشر میں بہاں سے تھکے لوگوں میں سے

نہیں نہرت ہیں گرم ریب پر ایسے ہند کے شیب و پاب میں جس کی تپش سے نہیں یہاں سوز
نمایاں ہو جائے۔

چہ خوش صحرا کہ دردے گا رواں ؟

دردے خواند و محمل پر آند

ہر ریک گرم او آور سجودے

جہیں را سوز تا داغے بماند

ہجو و زندہ مرداں کی کیفیت کا اظہار یوں ہوتا ہے

ہجو و زندہ مرداں می شناسی
خیار کار من گیر از ہجو دم
ورنہ جس من زان رون مائی سے تروم ہو کس ییہ رسم بن جاتی ہے ہی من سے دور
سے خالی سجدہ بھی ایک رسم بن کر رہ جاتا ہے۔

ورنہ داری خون گرم اندر بدن
سجدہ تو نیست جز رسم کہن
صفین کج دل پریشان سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندرون باقی نہیں ہے
تہاں نے بات تھی کہ بر صحنی ہے خدا کے حضور بھی دیں عرض کرتے ہیں
دگر کوں عالم شام و سحر کر
جہاں خشک و تر زیر و زبر کر
رہے تیری خدائی داغ سے پاک
مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر
بائیں مزید تنہیں میں کے بغیر ان اتھار کو پیش کردوں گا جہاں نصوں نے قیام سجدوں کی
مذمتوں و تیش کشی کرتے ہوئے ایک نئی معنویت مطلقا کی ہے۔

قیام

اقبال کے بڑا ایک قیام سجدوں کی یاد کی اور سجدہ ہمیں بندگی کی خدمت ہے ایک اور مقام پر قبال
نے یہ نہایت پرکشش بحث بیان کیا ہے شاہی قیام کا رمز ہے ورنہ سجدہ کا اور یہ دونوں ذات
محض و مطلق سے مستحضر ہیں۔

فقر و شاہی واردات مصطفیٰ است
ایں تجلی ہائے ذات مصطفیٰ است
ایں دو قوت از وجود مومن است
ایں قیام و آل ہجو دے مومن است

قیام میں رہا نماز ہے اور سجدہ میں رہا نیاز۔ قیام مقام استقامت اور سجدہ مقام تشویش اور یہ دونوں قیام سجدہ کی کھجائی اور سجدہ کی میں بدل جائے اور دونوں ایک دوسرے سے بے تعلق رہ جائیں تا اقبال کے نزدیک یہ زندگی کے اوتھورے اور یک رشتے پن کا اظہار ہیں بلکہ کاروبار جس میں وہی کسی نہ ف ایک ہی رشتہ کو اپنا لے تا ایسے انسان کا وجود سے معنی نہ جاتا ہے۔ یہ رم اقبال کی شاعری کا منفرد پہلو ہے۔

تیرا نیاز نہیں آشنائے نماز اب تک
کہ ہے قیام سے خالی تیری نماز اب تک
آہ قوے کہ بے تب و تاب حیات
روزگارِش بے نصیب از واردات
آں کے اندر سجود ایں در قیام
کاروبارش چوں صلوة ہے امام

ابلیس اس بات پر خوش ہے کہ

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نماز بے قیام

اور ہندوستان میں بعض ملا بھی اس بات پر رضامند ہیں

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

قبال نے یہ شعر تقریباً ساٹھ سال پہلے لکھا تھا لیکن آج بھی پڑتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اقبال کہیں یہ بات تو نہیں کہہ رہے ہیں کہ سجدہ کی تو اجازت ہے لیکن قیام کی نہیں۔ اس کے مسرعات سن سنا سہم کی ہسیت سے بے بہرہ اماموں کے بارے میں قبلا نے کہا تھا اور یہی وہ مندی سے کہا تھا

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے ؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

کبھی مضطرب ہو کر کہہ اٹھتے ہیں

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر
میں سے قبول میں بدوئی تیار کرتے ہیں جس کا مقام قیام ہے بعد ہے اور جس میں ملت ہے
زندگی کا پیام ہے۔

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام
تاریخ کے صوبہ ، یہاں میں قبول نے ان خطا جوں اور ملتوں کے سہارے ہوئے ،
زوال کی داستان بھی کہی ہے۔

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذان میں نہ
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رخشہ سیما
بہی ان سر نشینوں کی دہلیوں کے فطرت کے دور سے نکل کر ، نیا نو یکتائی تہذیب سے روستان
یا تہذیب نیست تھی

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں ، نظر میں ، اذان سحر میں
اس لئے اقبال یوں مجھوڑتے ہیں

اس خاک میں دب گئی تیری آگ
سحر کی اذان ہو گئی اب تو جاگ
وہ یہ آواز کرتے ہیں

کیا عجب میری نوائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تیری خاک میں ہے
تلاش کر اس کی فضاوں میں نصیب اپنا
جہان تازہ مری آہ سحرگاہ میں ہے

قبائل اپنے دیرے میں کہتے ہیں کہ رومی کی طرح انہوں نے موجودہ سکوت اور جمود کی
فتنہ میں وہ روافض بند کرتے ہیں اسرار جہاں سے گناہ کیا ہے۔

چو رومی درحرم دایم اذال من
ازو آمو ختم اسرار جاں من
ہر دور فتنہ عصر کہن او
ہر دور فتنہ عصر رواں من

ہیں نہیں جہہ باران طریقی و دعوت نبوی، پتے ہیں کہ آواز زندگی کی بازی بھر ایک بار
مردانہ، رسالت اور مصلحت سے تھیں اور اس امت کی بڑی بنا میں مسجد میں پتہ اس راستے آہ
تاریخ بند رہیں۔ سب سوز دال ملا جہی پھیل جائے اور اسے اپنا منصب یاد آجائے

بیا تا کار ایں امت بسا زیم
قمار زندگی مردانہ بازیم
چتاں تالیم اندر مسجد شہر
کہ دل در سینہ ملا گدا زیم

اقتباس کے ہیں جذب دروں 'سوزنہاں' تڑپ اور اضطراب کا روحانی سرچشمہ وہی ذات برائی
ہے جس نے سوز و آفتاب 'شباب زندگی' اور جس کے جدوہ کو 'تعبیہ خواب زندگی' کہتے ہیں اس
مضمون میں اس اصطلاحات اور مدتوں کے انبار کی نئی نئی جہتوں کو پیش کیا گیا ہے ان کا حسن
تاریخہ اظہار یوں نقطہ و کمال کو پہنچ جاتا ہے

در جہان ذکر و فکر انس و جاں
توصلو صبح تو بانگ اذال

دواہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا

”زندگی میں خواہش کی تکمیل اور عدم تکمیل دونوں جزئیے ہیں۔“ ہر تارا شاہ کا یہ قول انسانی خواہشات آرزوؤں سے پار ہے۔ میں ایک نیک نظر فی فی زندگی کرتا ہے خواہش بھی ہے خواہش چھٹی ہے یا بری یہ سوال مذہبی، اخلاقی و نفسیاتی اعتبار سے ممنوع بحث رہا ہے۔ خواہش یہاں خواہش سے مراد انسان کی فطری خواہشات اور حقیقی بات نہیں بلکہ ان خواہشات سے بات ہے جو مذہم و تکلیفی جاتی ہیں۔ جلد یہاں آرزو سے مراد وہ خواہش یا تمنا ہے جسے انسان اپنے اس میں بہانہ چاہتا ہے۔ رہتا ہے اور جس کے حصول کے لئے مخطوب و رعب بھیں رہتی ہے۔ خواہش جو اعلیٰ انسان کو اعلیٰ تر منازل سے ہمکنار کرتی ہے۔

مذہبی اعتبار سے اس تعلیمات میں جو مبادیہ سے منسوب ہیں یہ بات ملتی ہے کہ خواہش بری چیز ہے۔ اس سے اس سے نریر کرنا چاہیے۔ بدھ مت میں انسانی انانیت یا شخصیت والی اہمیت نہیں رہتی۔ ان کے نزدیک زندگی بہتادریا ہے جس میں موبہ نہیں آتی اور نریر جاتی ہیں۔ یعنی وہ جس کی نیات اور ارادت ہمسد ہے۔ ذاتی قدر بے معنی ہے لیکن جب انسان اپنے شخصیت یا ذات کو باقی رہنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا نتیجہ مصائب و آلام و رنج و غم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں ذاتی شخصیت کی بات ہوتی ہے ذاتی پسندیدگی اور نا پسندیدگی کے جذبات اور اس کے ساتھ خواہشات کا پیدا ہونا ہر کی ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر انسان کی خواہش کی تکمیل پوری طرح ممکن نہیں ہوتی جو وہ پسند کرتا ہے اسے حاصل نہیں کر سکتا اور جو نا پسند کرتا ہے اس سے بچ نہیں سکتا۔ اس سے مبادیہ کے نزدیک ہر خواہش فریب ہے۔ فریب اس لئے ہے کہ ہر خواہش کے پیچھے جو انسان کو بچہ نہیں دے ہوئے ہے یہ خیال کا رفرہ رہتا ہے کہ خواہش کی تکمیل ہو پھر تو نہایت اور کون مل جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا بلکہ دوسری خواہش سراٹھاتی ہے اور یوں اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش یہ دم لگے

کے بارے میں یہ وہ جہد کا سلسلہ تھا کہ انھیں بے درجہ جیتی کے چھوٹے نہیں، اس لئے خواہش
سارے شرکی جڑ سے نہیں سے چھتا ہے ورنہ ہے ورنہ اس طرح ممکن ہے کہ نفس کی اختیار کی جائے
یعنی وہ اس وقت ورتناؤں کا قلم لے لیں۔ نروان مسرت کا حصول کی نہیں بلکہ خواہش کے عدم وجود
کا۔ اس لئے یہ تمام یہی اعتبار سے ایک نقطہ نظر۔ زندگی کے بارے میں اس رویہ کی ہتھکڑیاں اور جی
نظر آتی ہیں۔ فلسفیانہ فطرت میں شہ پہنچا رہا جی یہی کہا ہے کہ خواہش امداد ہے، اس کی
تعمیل امداد۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی خواہش کا پورا ہونا ایک بری کاری ہوگی جسے ان کے خیر سے
بے ہوشی سے زندہ رہتی ہے تاکہ اس کی طبیعتوں کا سلسلہ جاری رہے۔

It is like the arms thrown to a beggar

that keeps him alive to day in order

that his misery may be prolonged tomorrow.

اس سے زیادہ ایک کی متعدد کا پورا ہونا خود اس متعدد کے لئے واجب ہے چنانچہ ایک چیز ۱۰ یوں کہتا ہے۔

the better is the enemy of the good
 بے نیاسان رقی و ام سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ غائب ہے شاید ہی خیال کی قربانی یوں کی تھی۔
 قید حیات و بند غم دونوں اصل میں ایک ہیں
 موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
 یا ایک اور انداز سے جگر نے بھی کہا تھا۔

مسرت زندگی کا دوسرا نام مسرت کی تمنا مستقل غم

اس نکتہ پر غور ہے ان ہادی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ رزق کا تقاضا تو اللہ تعالیٰ کے تصرف کا پیشہ دیدہ و
بندہ باعث رنج و آلام ہے۔ جسے شکر ہے۔ بے پروائی و غفلت جس کی اقباس نہ مانتی ہوتے ہیں، وہ
یہ ہے کہ خودی کی حیات و آرزو و رمت و سدّ فریضی پر موقوف ہے زندگی و بقدریں جن سے مل
بات معنی بنتا ہے نفس مجروح خیال یا فریب نہیں بلکہ ان کی روحانی اساس ہے جس نے علی حسب ممکن
کے حصول میں خودی کا اظہار و رزاقی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اقباس کے نزدیک رزق کی حدیث اور

نہیں ہی سے زندگی عائب ہے اور اس کے بغیر زندگی بے معنی ہے اس سے خواہش اور چاہائشیں
بد بختی سے تکیہ کر رہی ہیں یہاں وہ اب رہا ہے یہ شہر ہے کہ یہ بڑی خواہش تھی۔ اب اچھیں
سے بچتی ہیں اور طبعی خواہش زندگی و حیات ہے۔

تھی سے تھی۔ اب سے اب سے تھی خواہش اور چاہائشیں۔ یہ رہا ہے زندگی و موت
بے۔ اس نے عائب بھی، موت اور اس وقت کا یہ قدم قرار دیتے ہیں۔

جے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب

ہم نے دشت امکان کو اک نقش پا پایا

میں اپنے لئے، عشق کے مسافر سے امت میں سے زیادہ دشت، زمین و آسمان میں پانی
بے نی، سب سے وہ میں بھری کے اختیار دہانتے ہیں۔

جز ذوق طلب شوق سفر کچھ اور مجھے منظور نہیں

اے عشق بتا اب کیا ہوگا کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں

بد یہ فضا میں متکف نواز دیو کی سے رہتا، کے سسے میں بہا جاتا ہے کہ زندگی کے مختلف
انسان یہ نواز متکف انسان سے عبارت ہیں۔ مشاہدہ دیکھتے ہیں کہ لکے ہیں کہ مدھے میری
اور تمہارے یہ منزل رہیں، انہیں اس کی ہیں۔ ہم چھتے میں سے ہیں کہ ریشم کی منزل سے
کے زندگی سے نہیں پاس اس سے دے۔ لیکن اقبال یوں کہتے ہیں کہ جو کہ حیات خود اپنے راستہ
کے مانی ہے، حیات کی رہتا، تمنا میں خود اپنے انجبار کے سامان تلاش کر سکتی ہیں۔ ذوق صوفیہ
نے کشادگی رفتار سے پاس، رہیں کی ذوق نواز سے منتظر عطا کی ہے۔

بے عمر زندگی سے بار سے اس اقبال کے تہذیب و فکر و بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں "زندگی
کی تہذیب و فکر و تہذیب سے تہذیب ان حیات سے ہے مقصد۔" کا حکم نکلتا ہے اور بغیر خواہش اور
یقیناً اعلیٰ سب زمین کے سے بد و جہد ممکن نہیں۔ گویا زندگی عبارت ہے آرزو سے اور موت
آرزو سے محرومی ہے۔

مرک راسماں ز قطع آرزوست

قبال کے نزدیک وجود و دور میں انسانیت کا لمبہ یہ ہے کہ وہ اس آرزو سے محروم ہے

جواسے ہر ٹھوکر پر سنبھلنے کا حوصلہ عطا کرے اور جواسے موجودہ پستی سے اٹھا کر اعلیٰ منزلوں سے
ہمکنار کرے۔ اس لئے وہ سینہ میں بچلتی ہوئی آرزو کے خواہش مند ہیں۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است

اصل او در آرزو پوشیدہ است

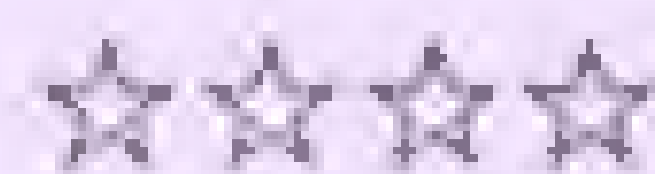
ماز تخلق مقاصد زندہ ایم

از شعاع آرزو تابندہ ایم

اور کہیں کہیں اقبال کے ہاں یہ لئے اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ وہ یہاں تک کہہ اٹھتے ہیں

متاع بے بہا ہے درد و سوز ' آرزو مندی

مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی



وقتِ آخر اور تشنگی کا ر

(آل انڈیا ریڈیو سے ایک نشریہ)

وقتِ آخر اور تشنگی کا ر۔ بات بڑی چونکا دینے والی اور ذہن کو جھنجھوڑ دینے والی ہے۔ جب انسان موت کی آہٹ محسوس کرنے لگے اور اس دنیا کے عمل سے اس کا رشتہ ٹوٹ جانے والا ہو تو اسے اپنی زندگی میں ادھورے پن کا احساس دامن گیر ہو۔ اُسے اپنے منصوبوں کے نامکمل رہ جانے اور اپنے ارادوں کے ٹوٹ جانے کا خیال ستانے لگے۔ نامرادیوں، محرومیوں کی خلش بے چین کر دے۔ وہ اپنی بے بسی اور کم نصیبی کا شکار ہو جائے۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب تو عمل کا دروازہ بند ہونے والا ہے۔ اب نہ تو عمر رفتہ کو آواز دی جاسکتی ہے نہ وقت کے دھارے کو پلنایا جاسکتا ہے! وقتِ آخر تشنگی ادھورے پن کی کیفیات مختلف انسانوں میں جدا ہو سکتی ہیں۔ خلش اور چین کی نوعیت الگ الگ ہو سکتی ہے۔

لیکن یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے۔ کیا تشنگی کا ر کا احساس اس وقت ہی ہوتا ہے جب موت آدب بچے یا زندگی کے ہر لمحہ میں یہ احساس ہمارے ساتھ ہے؟ کیا زندگی کے کسی لمحہ میں کوئی انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے کام سے مطمئن ہوں۔ میں اپنے ارادوں کی تکمیل میں کامیاب ہوں؟ کیا زندگی کے کسی لمحہ میں آسودگی کا احساس ممکن ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تشنگی کا ر کے اس احساس کو وقتِ آخر سے ہی کیوں متعلق کیا جائے؟ ایک یونانی مفکر نے کہا تھا اگر عقل مند انسان کو تھوڑی سی روٹی اور تھوڑا سا پانی میسر آجائے تو اسے اپنے آپ کو سب بڑے دیوتا جیو پیٹر کے برابر سمجھنا چاہئے لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ کیا انسان تھوڑی سی روٹی اور تھوڑے سے پانی پر قناعت کرنے آمادہ ہے؟ انسان کی نظرت کی گہرائیوں میں کبھی ختم نہ ہونے والی آرزوں اور تمناؤں کا ہجوم ہوتا ہے جو ہمیشہ تشنہ ہی رہتی ہیں۔ وہ اسی خیال میں گرفتار رہتا ہے کہ منزل کیلئے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے لیکن شاید منزل تک کبھی رسائی نہیں ہوتی۔ جتنا وہ قدم بہ قدم آگے بڑھتا جاتا ہے منزل دور سے دور ہوتی جاتی ہے۔ غالب نے شاید اسی حقیقت کی جانب یوں اشارہ کیا تھا۔

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
مری رفتار سے بھاگے ہے پیاباں مجھ سے

یا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ؟
ہم نے دشتِ امکاں کو اک نقشِ پایا پایا

اب اگر ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ اطمینان یا آسودگی جس کیفیت کا نام ہے اس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ خلش اور تھمیں تو ہر لمحہ موجود ہے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آرزو اور تمنا جو انسان کو ہمیشہ بے چین اور مضطرب رکھتی ہے پسندیدہ ہے نا پسندیدہ؟ زندگی میں خواہشات اور اس کے تسلسل کی کوئی حد نہیں ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت سے ارمان پورے ہو جائیں بھی تو یہ احساس ستائے کہ۔

بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

تو کیا مسلسل تشنگی کا احساس انسان کا مقدر ہے؟

برنارڈ شاہ نے کہا تھا خواہش کی تکمیل اور عدم تکمیل دونوں لمبے ہیں۔ یا، یا سیت پسند فلسفی شوپن ہاؤر نے بھی کہا تھا کہ خواہش لامحدود ہے اور اسکی تکمیل محدود۔ اور یہ کہ کسی خواہش کا پورا ہونا ایک بھکاری کو دی جانے والی وہ خیرات ہے جو آج اسے زندہ رکھتی ہے تاکہ کل بھی اس کی مصیبتوں کا سلسلہ جاری رہے۔ اس کے برعکس دوسرا نقطہ یہ ہے کہ آرزو نا پسندیدہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کو خوب سے خوب تر کی تلاش میں مصروف رکھتی ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغِ آرزو رہنا

بات بڑھتی جاری ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی پھر لوٹ کر وہیں پہنچ گئی ہے آئے اسے مختصر کر دیں
ایک طرف یہ خیال ہے کہ زندگی نفس نفس میں تشنگی کی داستاں لے ہوئے ہے یا جگر کے الفاظ میں

سرت زندگی کا دوسرا نام
سرت کی تمنا مستقل غم

اور دوسرا نقطہ نظر یہ ہے

نا صوری ہے زندگی دل کی

آہ ! وہ دل کے نا صبور نہیں

اب کیا ان خیالات میں تطابق اور ہم آہنگی ممکن ہے؟ کیا دونوں کو ایک حقیقت میں سمو یا جاسکتا ہے جہاں وقت آخرتنگی کا رکے ساتھ یہ احساس بھی رہے کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس دورا ہے پر آئیے ہم سلامتی کا راستہ تلاش کریں جس پر چل کر انسان اپنی نارسائی کے احساس کے باوجود مطمئن رہے۔ زندگی کی وہ قدریں جن سے عمل بامعنی بنتا ہے، محض مجرد خیال یا فریب نہیں ہے بلکہ ان کی بنیاد روحانی اور اخلاقی ہے۔ اقبال نے اس بات کو یوں پیش کیا ہے۔

مستاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی

مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خدا وندی

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں ایک درد و سوز آرزو مندی ہے اور دوسرا مقام بندگی ہے اگر عمل کا مقصود بندگی ہو اگر ہر کام کا مقصود ذات واجب اور اس کی رضا ہو تو انسان اپنی محدودیت میں لامحدودیت کی شان محسوس کر سکتا ہے۔ یہاں تشنگی کا احساس باقی نہیں رہتا بلکہ یہی وہ منزل ہوتی ہے جہاں بقول حضرت علیؑ عزائم کی شکست بھی عرفان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ عبدیت کا احساس اسے ہر آن محرومی کے احساس سے بالاتر کر دیتا ہے بس عمل اور مسلسل عمل اس کا مقصد ہے۔ اگر اس سفر میں دنیا ئے عمل سے کوچ کا لمحہ آ بھی جائے تو قلب مطمئن رہے۔ وہ لمحہ حزن اور حرماں نصیبی کا نہیں ہے بلکہ شاید اسی کو نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔